جلد ۹۰ | جنوری ۱۹۵۹ء | عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جنوری ۱۹۷۹ء مطابق صفر ۱۳۹۹ھ	جلد ۹۰

اشارات: | جناب نعیم صدیقی صاحب | ۲

مقالات:

تعزیرات اسلام | مولانا بشیر احمد صاحب قاضی | ۹

امام المحدثین حضرت امام بخاریؒ | جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب | ۲۱

تعلیم کا تہذیبی نظریہ اور ہم | جناب نعیم صدیقی صاحب | ۳۰

رسائل و مسائل:

اسلامی حدود و تعزیرات سے متعلق چند توضیحات | جناب ملک غلام علی صاحب | ۳۶

مطبوعات: | (ادارہ) | ۴۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

محترم جنرل محمد ضیاء الحق کے اعلامیۂ محرم کا، نظامِ اسلامی کے افتتاحی قدم کی حیثیت سے، ہم دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی مشاورتی کونسل، وفاقی وزراء دینی جماعتوں اور اسلام پسند صحافیوں کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں جن کی مساعی اس اعلامیہ کے سامنے آنے میں شامل ہیں۔

فی الحقیقت یہ اعلامیہ جو آگے آنے والے مزید فیصلوں کا مقدمہ ہے، کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے، بلکہ اس میں بڑی تاریخی اہمیت پائی جاتی ہے۔ اس اعلامیہ نے آئندہ کی قانونی، تعلیمی اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے رُخ متعین کر دیا ہے اور لادینی طرزِ فکر کے لیے راستہ بند کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اتنا سا کام کرنے کی جرأت نہ فوجی آمروں کو ہوئی اور نہ مضبوط کرسیوں والے وزیروں کو۔ ہماری ۳۰ سالہ تاریخ میں یہ اقدام پہلی بار ہو سکا۔

تھوڑی دیر کے لیے شرعی قوانین اور عشر و زکوٰۃ اور غیر سودی بنک کاری اور عدالتوں کے ساتھ شریعت بنچوں کے قیام کے بڑے بڑے فیصلوں کو درکنار رکھ کے، اگر صرف دفاتر میں اقامت صلوٰۃ کے حکم کے اثرات کو سامنے رکھا جائے تو غلبۂ اسلام کی امیدوں کا ایک کشادہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

بیوروکریسی کے دائرے میں سیکولر طرزِ فکر کا جو غلبہ چلا آرہا ہے۔ اس اقدام سے (بشرطیکہ اُسے پوری قوت سے آگے بڑھایا جاسکے) وہ ٹوٹ جائے گا۔ خصوصاً ہمارے صاحب بہادر کو جب نماز کی صف میں اپنے کلرک اور قاصد (سابق نام چپڑاسی) کے ساتھ کندھے ملا کر کھڑے ہونا

ہوگا تو اِس سے نہ صرف اس کی پتلون کی روایتی "کریز" ٹوٹے گی بلکہ ساتھ ہی وہ سلاخ بھی ٹوٹ جائے گی جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے گذر کر اُس کی گردن کو اکڑائے رکھتی ہے۔

نماز کے اجتماع میں اگر کسی کو لیڈری کرنی ہو تو اُسے امامِ صلوٰۃ بننے کی قابلیت پیدا کرنی ہوگی۔ اب جن لوگوں نے بچپن سے کبھی کلمہ تک صحت کے ساتھ نہ پڑھا ہو، وہ بیچارے کہاں سورتیں اور ضروری مسائل نماز کو یاد کر کے قیادتِ نماز کے مصلّیٰ تک پہنچ سکیں گے۔ جو اعلیٰ افسران پہلے سے یہ صلاحیت رکھتے ہیں، ان کا مقام پہلے سے برتر ہوگا اور ان کی وجہ سے ان کے ماتحتوں میں نماز پہلے سے زیادہ قابلِ توجہ ہو جائے گی۔ اور جو افسران اپنے کسی ماتحت کے پیچھے نماز پڑھنے پر مجبور ہو گئے، ان کے ذہنوں میں خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں معاشرے میں تحریکِ نماز کا یہ بہترین آغاز ہے کہ اس مہم کو سرکاری دفتروں اور اداروں سے شروع کیا گیا ہے۔

اب جوں جوں اقامتِ صلوٰۃ کا دائرہ پھیلے گا، لوگوں کی ذہنیتوں کا لاابالی پن ختم ہوگا اور اسلامی نظام کے لیے راستہ کشادہ ہوتا جائے گا۔

لیکن اس کی شرط لازم یہی ہے کہ اسلامی نظام کی علمبرداری کرنے والی حکومت کے سرکاری اداروں میں نماز کے لیے محض اپیل پر معاملہ روک نہ دیا جائے بلکہ واضح حکم کے ذریعے یہ طے کر دیا جائے کہ ایک تو پابندیٔ نماز اور ترکِ نماز کے سلسلے میں کانفیڈینشل رپورٹس اور فائلوں میں ریمارکس ثبت ہوں گے اور ہر قسم کی ترقی کا فیصلہ کرتے ہوئے ان ریمارکس کو بھی دوسری باتوں کے ساتھ اہمیت دی جائے گی۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً معائنہ ٹیمیں عین نماز کے وقت مختلف دفاتر اور اداروں میں جا کر دیکھیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کے لیے کیا ہو رہا ہے۔ اور کون لوگ اس سعادت سے اپنے آپ کو محروم رکھنے والے ہیں۔ ہر ماتحت ملازم کو حق دیا جائے کہ وہ اپنے بے نماز افسروں کے متعلق خفیہ اطلاعات دے۔ اور ان پر نوٹس لیا جائے۔ نیز پبلک کے نمائندگان خصوصاً قومی اتحاد سے تعلق رکھنے والے لیڈروں اور کارکنوں کو دیکھ بھال کرنی چاہیے کہ ان کے قریب کے سکولوں، دفتروں، ڈاک خانوں، تھانوں، وغیرہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے لیے کیا کچھ ہو رہا ہے اور کہاں تک گریز اور فرار پایا جاتا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ انحراف اور رُوگردانی

کرنے والے افسروں اور ملازموں کے متعلق سختی سے نوٹس لیا جائے۔ پہلی بار تنبیہ کی جائے، دوسری بار باقاعدہ انکوائری کر کے تنزلی یا تبادلے کا حکم دیا جائے اور تیسری بار اگر تحقیقات سے ترکِ نماز کا جرم ثابت ہو تو ایسے شخص کو برطرف کر دیا جائے۔

زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ضابطۂ ملازمت میں ایک مختصر سی دفعہ کا اضافہ کر دیا جائے کہ ہر سرکاری ملازم جو مسلمان ہو، اس بات کا پابند ہوگا کہ وہ خود اور اس کے زیرِ کفالت افراد اسلامی عباداتِ اور فرائض ادا کریں اور تمام ممنوعاتِ شرعیہ سے مجتنب رہیں۔

یہ ایک دفعہ سرکاری مشینری سے وابستہ تمام افراد کو کَس دے گی۔

مزید اقدامات جو تدریجاً اس سلسلے میں کرنے چاہئیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ نیم سرکاری اداروں سے وابستگان کے لیے بھی اس سلسلے میں حکم جاری کیا جائے اور اُن کی شرائطِ ملازمت میں بھی اوپر کی مجوزہ دفعہ شامل کی جائے۔

۲۔ اگلے قدم کے طور پر تمام پبلک فرمز کے تحت چلنے والے کاروباری اداروں اور کارخانوں اور دفتروں کے لیے بھی حکم جاری کر دیا جائے۔ اور اس حکم کی کامیاب تنفیذ کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں۔

۳۔ یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ مڈل سکول سے اوپر کے تمام داخلوں، مختلف تربیتی اور ٹکنیکل اداروں میں شمولیت، ملازمتوں کے انٹرویوز کے لیے درخواست دہندہ کو سابق تعلیمی ادارے کی طرف سے چال چلن سرٹیفکیٹ کے ساتھ یہ تصدیق بھی پیش کرنی ہوگی کہ وہ پابندِ نماز رہا ہے۔ انٹرویوز وغیرہ میں نماز کا کوئی بھی حصہ (یا نماز میں پڑھی جانے والی چھوٹی سورتوں میں سے) امیدواروں سے سنا جا سکتا ہے، اور سادہ قسم کے مسائلِ نماز کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ مختلف ٹریننگ کالجوں اور سکولوں، اعلیٰ عہدوں کے تربیتی اداروں، اور ہر قسم کے ریفریشر کورسز میں اسلامیات کے ضمن میں نماز کے متعلق بھی ایک مختصر نصاب اور پرچوں میں سوالات رکھے جائیں۔ نیز عملاً شرکتِ نماز ہر زیرِ تربیت فرد کے لیے لازم ہو۔

۵ - ذرائع ابلاغ - ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سے بھی نہایت خوبصورت طریقوں سے (مثلاً مکالموں کی صورت میں) نماز کی ترغیب بھی دلائی جائے اور اس کے متعلق تعلیم بھی دی جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اگر اخبارات میں بہت خوبصورت اور مؤثر طریق سے پبلسٹی مسلسل جاری رکھی جائے تو مفید ہوگا۔

اس قسم کے اقدامات سے جب ملک کے منظم ادارات میں نماز جڑ پکڑ لے گی تو پھر اس کا معاشرے میں عام پھیلاؤ آسان ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں دینی اداروں اور جماعتوں کے ساتھ ساتھ اسلامی طرزِ فکر رکھنے والی سیاسی جماعتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اصلاحِ معاشرہ کی اس بنیادی اسکیم پر پورا پورا زور صرف کریں۔ پبلسٹی کریں، تبلیغی اجتماعات کریں، بیٹھکوں اور محلوں میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات کر کے کہیں تقریر کے ذریعے اور کہیں بات چیت کے ذریعے عوام کو نماز کی ترغیب دلائیں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور کاروباری اداروں کے وابستگان میں تبلیغی کام بھی کریں اور تساہل کرنے والوں کے خلاف اوپر والوں کو مطلع بھی رکھیں۔

ایسے مختصر اور آسان لٹریچر کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعے عام آدمی نماز میں پڑھے جانے والے کلمات، نماز کے اوقات، نماز پڑھنے کا طریقہ، مختلف وقتوں کی تعدادِ رکعت، اور دیگر اہم روزمرہ مسائل کو جان سکیں۔

انگریزی خواں افسران کے لیے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایسا لٹریچر مہیا کیا جانا چاہیے۔

ایک مشورہ اور ہا

نماز جمعہ کا اہتمامِ خاص بہت اچھی چیز ہے، اور اس کے لیے سائرن کا تجربہ بہتر ثابت ہوا ہے۔ ہو سکے تو تمام شہروں میں اس کا انتظام کیا جائے۔ اور یہ خصوصی اعلان بھی کر دیا جائے کہ

سائرن ہونے کے بعد پندرہ منٹ کے اندر اندر تمام دکانیں اور خوانچے بند کر دیے جائیں اور عملاً کوئی لین دین نہ کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ٹریفک بند ہو جانا چاہیے اور گاڑیاں یا سائیکل وغیرہ بھی رک جائیں۔ ۱۵ منٹ میں لوگ با سانی منزل یا مسجد تک پہنچ سکتے ہیں۔

ساتھ ہی گذارش یہ ہے کہ کاروباری حلقوں میں جمعہ کی جو چھٹی رائج ہے، اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔ بڑی لمبی محنت کے بعد یہ چھٹی تسلیم ہوئی۔ اب پھر ادل بدل کرنا مناسب نہ ہوگا۔

اب اعلامیہ محرم کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق چند باتیں۔

اوّل جب یہ اعلان ہوا تھا کہ بہت جلد ایسا دستوری فیصلہ سامنے آ جائے گا کہ جس کے تحت کسی بھی قانون کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جاسکے گا کہ وہ شریعت کے خلاف ہے —— تو اسی وقت مجھے پریشانی ہوئی کہ ایسا ہونا کسی قلیل مدت میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قانونی نظام، مالیاتی نظام اور عدالتی نظام (بلکہ تعلیمی اور فوجی نظام وغیرہ بھی شامل ہیں) کی تشکیل نو شریعت کے مطابق نہیں کر لی جاتی، اس قسم کا حکم یا دستوری فرمان سخت مشکلات پیدا کرے گا۔ بلکہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

اور اب اس اعلان کی مشکل کو حل کرنے کے لیے اتنے قوانین اور اداروں کو آئینی تحفظ دے دیا گیا ہے کہ اعلان کے مطابق چیلنج کرنے کے حکم کا دائرۂ اثر بے حد محدود بلکہ برائے نام ہے۔ آخر خواہ مخواہ اس اعلان کو نبھانے کی ضرورت کیا تھی۔ جوں جوں یہ وسیع دائرۂ تحفظ کے خلاف ہو رہی ہے، زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترکِ اعلان کے بارے میں ہو جاتی۔

ذمہ داری دراصل سی، ایم، ایل اے جنرل محمد ضیاء الحق کے اُن قانونی مشیروں پر جاتی ہے جنہوں نے ایک قانونی فیصلے کے اثرات کا بر وقت اندازہ نہیں کیا۔

اب بھی کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اقرار کر لیا جائے کہ متذکرہ اعلان کے تقاضے پورے کرنے کا وقت ابھی دور ہے۔ فی الحال اسے واپس لیا جاتا ہے۔

بصورت موجودہ جن اداروں اور قوانین کو تحفظ دیا گیا ہے، ان میں دَورِ ایوبی کے

فیملی لاز کا شامل کیا جانا حیرت ناک ہے ۔ ان فیملی لاز کو تمام مکاتبِ فکر کے علما نے متفقہ طور پر ناقابلِ قبول قرار دیا تھا، اس جسارت پر بعض اصحاب نشانۂ عتاب بھی بنے ۔ ان کی آرا کا ریکارڈ بھی موجود ہے، اور چاہیں تو از سرِ نو اسلامی مشاورتی کونسل اپنے موجودہ ارکان کی مدد سے، یا زیادہ وسیع حلقۂ علما کی مجلس بلا کر ان قوانین کی تشکیلِ نو کر سکتی ہے ۔ اور بہت تھوڑے وقت میں یہ قوانین صحیح شکل میں نافذ ہو سکتے ہیں ۔ اس کے بعد کوئی انہیں چیلنج کرنا چاہے تو کرے ۔

اسی طرح شریعت بنچوں کے قیام کا فیصلہ ایک لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے، لیکن دوسری طرف عدالتوں اور شریعت بنچوں کا دوہرا انتظام کار بعض پیچیدگیوں کا بھی موجب ہو گا ـــ نیز جناب خالد اسحٰق ایڈووکیٹ نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ اپنی جگہ بے حد اہم ہے کہ عدالتوں کے سامنے تو قانونی نکات واقعاتی احوال کے اندر رکھے جاتے ہیں، لیکن شریعت بنچوں کے سامنے قانونی نکات ایسی حالت میں غور و بحث کے لیے آئیں گے کہ واقعاتی احوال کا رشتہ ان کے ساتھ قائم نہیں ہو گا ۔ شریعت بنچوں کی بحثیں خالص نظری بحثیں ہوں گی ۔ اور اجتہاد کے لیے واقعات و احوال کے پس منظر کو سامنے رکھنے کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہو گی ۔ میں داد دیتا ہوں خالد اسحٰق صاحب کے اس اندیشے کی کہ ایسی صورت میں شریعت بنچ قرونِ وسطیٰ کے اجتہادات کے نفاذ کا ذریعہ بن جائیں گے ۔

کچھ اور عملی پیچیدگیاں بھی ہیں جن کا ذکر حذف کرتا ہوں ۔

ایک اور مسئلہ جو خالد اسحٰق صاحب نے چھیڑا ہے ۔ وہ بھی اہم ہے ۔ یعنی اگر اعلامیۂ محرم کے اقدامات کے پیچھے دستوری فیصلہ نہ ہوا اور اس کے لیے ضروری دستوری ترامیم نہ کی گئیں تو آنے والی کوئی بھی حکومت پہلے ہی دن سارے کیے کرائے کو کالعدم کر سکے گی ۔

تاہم، متذکرہ بحثوں سے قطع نظر تحفظِ عقیدہ، چوری، ڈاکے، اغوا، زنا، شراب نوشی وغیرہ جرائم کے لیے اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ کے لیے جو قانون سازی کی جا رہی ہے (اور بیشتر کام ہو چکا ہے) وہ بہت مبارک ہے ۔

اسی کے ساتھ زکوٰۃ و عشر کا نظام جاری کرنے کے لیے جو فیصلہ ہوا ہے اور جس کے لیے تیاریاں کی جا رہی ہیں، نیز سودی بنک کاری کو ختم کرنے، اور جب تک پوری طرح انسدادِ ربوٰ نہیں ہو جاتا اُس وقت تک غریب اور درمیانہ طبقے کے لوگوں کو تعمیر مکانات وغیرہ کے لیے حاصل کردہ قرضوں پر سود کے معاف کرنے کا جو اعلان ہوا ہے وہ بھی خیر مقدم کے قابل ہے۔

بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک اچھا آغاز ہے، نظامِ اسلامی کے قیام کی مہم کے لیے۔ اس سے پہلے حکومتیں اسلام کے نعروں اور کچھ وعدوں سے آگے نہیں بڑھیں۔ اکتیس سال میں کوئی کام نہیں ہوا۔ بلکہ اُلٹا اسلام کے نام پر اسلام سے دُور لے جانے کے اقدامات ہوتے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک حکومت نے غلبۂ اسلام کے لیے قانون اور مالیات و اقتصادیات کے میدان میں عملاً قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایسا ایک اقدام بھی ہزار بار مبارک باد کا مستحق ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ متعدد اقدامات بیک وقت کیے جا رہے ہیں۔

اِن تبدیلیوں کا لازمی تقاضا یہ ہوگا کہ ان سے متضاد پڑنے والے ادارے اور قوانین برقرار نہیں رہ سکیں گے۔ حکومت کو بڑی تیز رفتاری سے تبدیلی کی اس رَو کو آگے بڑھانا پڑے گا۔

بہر حال ان خوش آئند اقدامات پر ہم محترم جنرل محمد ضیاء الحق، اسلامی کونسل، موجودہ وفاقی وزراء، قومی اتحاد کے صدر اور دیگر قائدین و متوسلین کو ہدیۂ تبریک کہتے ہیں کہ خدا نے ان سب کی مساعی کو یہاں تک پہنچایا۔

اس سمت میں جو قدم بھی اُٹھے گا، پوری مسلمان قوم آپ کی پشت پر ہوگی۔

اعلامیۂ محرم نئے سالِ ہجری کے آغاز کے ساتھ پاکستان میں ایک نئے اسلامی دَور کا پیرایۂ آغاز بھی ہے۔ اس اعلامیے نے ہمارے حوصلے بلند کر دیے ہیں اور ان شاء اللہ اسلام کا ہر محب میدانِ عمل میں بڑھ چڑھ کر کام کرے گا۔

اس اعلامیے کے تحریک انگیز اثرات عالمِ اسلام کے مختلف حصوں پر پڑ رہے ہیں

(باقی بر صفحہ ۴۶)

تعزیراتِ اسلام

جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب - باغ - آزاد کشمیر

(۱۴)

فصل ششم

دفعہ ۷ - آلۂ قصاص -

ا - قصاص تلوار یا تلوار جیسے آہنی آلہ سے لیا جائے گا۔[۱]

ب - اس آہنی آلہ کو مجرم کی گردن میں مار کر گردن کو جدا کیا جائے گا۔ پھر مقتول کی لاش، کو اس کے ورثاء کے حوالے کیا جائے گا۔[۲]

ج - قصاص مجمع عام میں لیا جائے گا۔

فقہاء کا اختلاف -

تشریح ۱ - احناف کے نزدیک قصاص تلوار یا تلوار جیسے آہنی آلہ سے لیا جائے گا اور امام شافعیؒ کے نزدیک آلۂ قصاص متعین نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی مخصوص طریقہ قصاص متعین ہے۔ اُن کے نزدیک قصاص بالمثل ہو گا۔ یعنی جس آلہ اور جس نوعیت سے جرم صادر ہوا ہے۔ اسی نوعیت اور اسی طریقہ سے مجرم سے بدلہ یعنی قصاص لیا جائے گا، بشرطیکہ بالمثل کے لیے کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو۔ جب کہ احناف کے نزدیک قصاص بالمثل نہ ہو گا۔

---

[۱] ہدایہ - جلد ۴ ص ۵۶۳ - [۲] عالمگیری -

بلکہ تلوار یا آلہ مثل تلوار کے ہو گا۔

امام شافعیؒ بطور دلیل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ (النحل) یعنی اگر تم بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی لو جتنا کہ تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ، یعنی "تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ اس نے تم پر کی ہے"۔ اور حدیث میں آتا ہے: مَنْ حَرَّقَ حَرَّقْنَاهُ وَمَنْ غَرَّقَ غَرَّقْنَاهُ [1]۔ یعنی جو شخص کسی کو آگ میں جلائے گا۔ ہم اس کو جلائیں گے اور جو پانی میں کسی کو غرق کرے گا۔ ہم اس کو غرق کریں گے۔ نیز حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے سر کو پتھر سے کچل کر قصاص لیا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی جاریہ کے سر کو دو پتھروں کے درمیان کچلا تھا [2]۔

مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر امام شافعی فرماتے ہیں کہ قصاص بالمثل ہو گا یعنی تلوار سے لینا ضروری نہ ہو گا۔

احناف فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کی بنیاد پر سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بدلہ میں زیادتی حرام ہے۔ اور قصاص بقدر جرم ہو گا۔ یعنی سزا میں مماثلت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ مماثلت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب کہ قصاص تلوار یا تلوار جیسے کسی آہنی آلہ سے لیا جائے۔ اگر قصاص اسی ذریعہ سے لیا جائے، جس سے جرم صادر ہوا ہے تو مماثلت قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلاً بعض اوقات قاتل کی صرف ایک دفعہ کی ضرب سے آدمی قتل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قاتل بھی صرف ایک ضرب سے قتل ہو جائے اس طرح کے واقعہ کی صورت میں ایک ضرب سے اگر قاتل قتل نہ ہو تو پھر اگر اس کو ایک سے زائد ضربات پہنچائی جائیں حتی کہ وہ قتل ہو جائے تو مماثلت قائم نہ رہے گی۔ اور اگر ایک ضرب سے وہ قتل

---

[1] بحوالہ سبل السلام جلد ۳ ص ۲۳۶۔

[2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۵۹۔

نہ ہو اور مزید ضربات ترک کر دی جائیں تو قصاص نہ ہو گا۔ جس کا حاصل یہ نکلے گا کہ مقتول کا خون بغیر بدلہ کے رہ گیا۔ یعنی اس کا خون رائگاں گیا۔ اور یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ لہٰذا قصاص صرف تلوار یا اس جیسے آلہ سے لیا جائے گا اس سے کوئی اشکال پیش نہ آئے گا۔ یہی احناف کا مسلک ہے[1]

اور حدیث مَنْ حَرَّقَ حَرَّقْنَاهُ الخ اور انس بن مالکؓ کی حدیث کے بارے میں احناف کا موقف یہ ہے کہ یہ سزا "سیاسۃً" یعنی تعزیری طور پر ہے۔ اس سے کلیہ قاعدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا تعزیری ہونا خود اس لفظ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی "غَرَّقْنَاهُ" یہاں غَرَّقَ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف کی ہے۔ یعنی آپ نے فرمایا جو کسی کو غرق کرے گا ہم اس کو غرق کریں گے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کسی کو غرق کرے گے اس کو بھی غرق کیا جائے گا۔ تاکہ کلیہ قاعدہ معلوم ہوتا کہ قصاص بالمثل ہو گا۔[2]

احناف اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ[3] یعنی قصاص تلوار کے علاوہ کسی چیز سے نہ لیا جائے گا۔

یہاں سیف سے مراد "سلاح" ہے۔ یعنی ہر وہ آہنی آلہ جو تلوار کی طرح چیر پھاڑ کر ٹکڑے کر سکتا ہو۔ اس عموم سے معلوم ہوا کہ تلوار کے علاوہ تلوار جیسے آہنی آلہ سے قصاص لیا جا سکتا ہے[4]

تشریح ۲:۔

درحقیقت شرعی ہدایت قتل کرنے کے بارے میں یہ ہے کہ مجرم کو اس طور پر قتل کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] تفصیل دیکھیے۔ اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۷۸۔

[2] البحر جلد ۸ ص ۳۳۸ و ہدایۃ جلد ۴ ص ۵۶۶۔

[3] ہدایۃ جلد ۴ ص ۵۶۳۔

[4] البحر جلد ۸ ص ۳۳۸ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت۔

کا ارشاد ہے،

اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَهٗ [۱]

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور جب تم قتل کرنے لگو تو اچھی حالت پر قتل کرو۔ اور جب تم ذبح کرنے لگو تو عمدہ طور پر ذبح کرو اور تم میں سے ہر ایک کے لیے چھری کو تیز کرنا اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچانا ضروری ہے۔ (یعنی ذبیح کو ٹھنڈا ہونے سے قبل صاف کرنا شروع نہ کیا جائے)۔

اس حدیث میں چھری تیز کرنا اور اچھی حالت پر قتل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مقتول کی تکلیف کو جہاں تک ہو سکے کم کیا جائے۔ اس لیے شریعت نے تلوار یا تلوار جیسے آہنی آلہ سے قصاص لینے کا حکم دیا ہے۔

فصل ہفتم ـــــــ اِکراہ

دفعہ ۳۔ اکراہ کی تعریف۔

اکراہ سے مراد وہ فعل ہے جو جبر کرنے والے سے صادر ہو کر مجبور شخص کے دل میں ایسا اثر پیدا کر دے جس کی وجہ سے مجبوراً اس کو وہ فعل کرنا پڑے جس کا جابر نے اس سے مطالبہ کیا ہے[۲]۔

تشریح ۱:۔ مذکورہ اکراہ کی تعریف شرعی تعریف ہے اور لغت میں اکراہ "حَمْلُ الْاِنْسَانِ عَلٰی شَیْءٍ یَكْرَهُهٗ"[۳] کو کہتے ہیں یعنی کسی انسان کو ایسی چیز پر ابھارنا جس کو وہ (یعنی دوسرا شخص) ناپسند کرتا ہو۔ اور ناپسند کرنا عام ہے خواہ طبعی ہو یا شرعی[۴]

---

[۱] رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ کتاب الصید والذبیح ص ۳۵۷۔

[۲] الدر المختار جلد ۵ ص ۸۳ [۳] ایضاً [۴] ایضاً

کراہت کی ضد میں محبت اور رضا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَعَسَىٰٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰٓ اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔

(ہوسکتا ہے کہ بُری لگے تم کو ایک چیز حالانکہ وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تمہارے حق میں)۔

اہل سنت والجماعت کا قول ہے"

"اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يكره الكفر والمعاصى اى لا يحبها ولا يرضىٰ بها[۱]"

یعنی اللہ تعالیٰ کفر و معاصی کو پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے راضی ہوتے ہیں۔

تشریح ۲

اوپر شرعی تعریف میں جابر سے صادر ہونے والا فعل عام ہے، خواہ حقیقی ہو یا حکمی۔ لہٰذا زبانی دھمکی بھی جابر کا فعل شمار ہوگا۔ نیز یہ کہ اگر مجبور شخص کو دلالتِ حال سے یہ غلبۂ ظن حاصل ہو جائے کہ اگر وہ جابر کے حکم مطابق عمل نہ کرے گا تو اس کو جان یا کسی عضو وغیرہ سے محروم ہونا پڑے تو اس کا یہ رویہ بھی فعلِ حکمی میں داخل ہوگا[۲]۔

دفعہ ۹۔ اکراہ کی اقسام۔

اکراہ کی دو قسمیں ہیں،

۱۔ اکراہ تام ۲۔ اکراہ ناقص[۳]۔

دفعہ ۱۰۔ اکراہ تام کی تعریف۔ (۱) اکراہ تام سے مراد وہ اکراہ ہے جو اضطرار

---

[۱] البدائع جلد ۷ کتاب الاکراہ ص ۱۷۵

[۲] الدر المختار الشامی۔ جلد ۵ ص ۸۳

[۳] البحر جلد ۸۔ کتاب الاکراہ ص ۷۹۔

کو واجب کر دے[1]۔

ب۔ اضطرار کے وجود کے لیے ضروری ہے کہ مجبور کو یہ خوف پیدا ہو چکا ہو کہ اگر وہ جابر کے حکم کے مطابق عمل نہ کرے گا تو وہ اس کو جان سے مار ڈالے گا۔ اس کا کوئی عضو یا اس کا کل مال تلف کر دے گا۔ یا اُس کو مہلک ضرب پہنچائے گا تو ان صورتوں میں اضطرار واقع ہو گا[2]۔

۳۔ اکراہِ تام میں فعل جبر کرنے والے کی طرف ان تمام صورتوں میں منسوب ہو گا، جن کے اندر مجبور شخص صرف ایک آلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور جن کے اندر صلاحیت نہ رکھے۔ ان صورتوں میں فعل مجبور شخص کی طرف منسوب ہو گا۔ جابر کی طرف نہ ہو گا[3]۔

تشریح:۔ کسی کی جان کو یا مال کو تلف کرنے کی صورت میں مجبور آلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا فعل جابر کی طرف منسوب ہو گا اور جماع کرنے اور اقوال کے اندر مجبور آلہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ دوسرے کے منہ سے کلام نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی دوسرے کے منہ سے کوئی چیز کھا سکتا ہے لہٰذا اس طرح کی صورتوں میں فعل کی نسبت جابر کی طرف نہ ہو گی بلکہ مجبور کی طرف ہو گی[4]۔

د۔ اکراہ تام ان تمام جرائم میں مؤثر ہو گا جن میں مجبور، جابر کا آلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں مجبور کا اختیار فاسد متصوّر ہو گا[5]۔

۴۔ جو اُمور صحتِ رضا پر موقوف ہیں۔ جیسے بیع، شراء، ہبہ۔ اجارہ اور اقرار وغیرہ۔ یہ اکراہِ تام سے فاسداً منعقد ہوں گے۔ اور اکراہ ختم ہونے کے بعد مجبور شخص ان عقود کے فسخ کرانے یا قبول کرنے کا مجاز ہو گا[6]۔

---

[1] البحر جلد ۸ کتاب الاکراہ۔ ص ۷۹

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ کتاب الاکراہ ص ۸۳۔ [3] ایضاً

[4] شامی جلد ۵ ص ۸۳، ۸۸۔ [5] ایضاً

[6] الدر المختار جلد ۵ ص ۸۴، ۸۵۔

تشریح :- اکراہ تام ہو یا ناقص اس سے مجبور کی رضا ختم ہو جاتی ہے اس لیے جو امور رضا پر موقوف ہیں - ان کو اکراہ کے ختم ہونے کے بعد مجبور، فسخ کرانے کا مجاز ہوگا۔ سردست عقودِ متذکرہ شق ۲ کا انعقاد ہو جائے گا کیونکہ ان کے ارکان اپنے محل کے اندر پائے گئے اور ان امور کے اندر مجبور کا اختیار بھی قائم رہتا ہے۔

دفعہ ۱۱ - اکراہِ ناقص کی تعریف۔

ا - اکراہِ ناقص سے مراد وہ اکراہ ہے جس میں قتلِ نفس، قطعِ عضو یا اعضاء یا کل مال لینے سے کم درجہ کی دھمکی دی گئی ہو[1]

ب - اکراہِ ناقص سے بھی رضا معدوم ہو جاتی ہے، البتہ اس سے اضطرار واجب نہیں ہوتا اور نہ ہی مجبور کا اختیار فاسد ہوتا ہے[2]

ج - اکراہ کی یہ قسم قتل اور قطع وغیرہ جرائم میں مؤثر نہ ہوگی - لہٰذا اس اکراہ میں قصاص کی سزا، جبر کرنے والے کو نہ دی جائے گی۔ بلکہ مجبور کو دی جائے گی[3] جابر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

د - اکراہ کی یہ قسم ان امور میں مؤثر ہوگی جو رضا پر موقوف ہیں[4]۔

دفعہ ۱۲ - اکراہ کی شرائط۔

اکراہ خواہ تام ہو یا ناقص، کے وجود کے لیے مندرجہ شرائط کا ہونا ضروری ہے - ان میں سے اگر کوئی ایک شرط بھی فوت ہو جائے تو اکراہ ثابت نہ ہوگا۔

ا - جابر اپنے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں مامور کو جس چیز سے ڈرائے، دھمکائے اس کو مامور پر واقع کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو[5]

---

[1] الدر المختار جلد ۵ ص ۸۳ والبحر جلد ۸ ص ۷۹ -

[2] البحر ص ۷۹

[3] الدر المختار جلد ۵ - ص ۸۴، ۸۵

[4] ایضاً -

[5] ایضاً ص ۸۳

۲۔ دھمکی کا وقوع مجبور کے غالب گمان کے مطابق فی الحال متوقع ہو۔[1]

تشریح:۔ مجبور کو معقول طریقہ سے اس بات کا ظن غالب حاصل ہو چکا ہو کہ اگر وہ جابر کے کہنے کے مطابق عمل نہ کرے گا تو وہ ابھی اس چیز کو واقع کر دے گا جس کی اُس نے دھمکی دی ہے۔

۳۔ اکراہ تام کے ثبوت کے لیے قتلِ نفس، مہلک ضرب یا قطع عضو یا اعضاء یا کل مال لینے سے کم درجہ کی دھمکی نہ ہو۔ اگر دھمکی صرف موجبِ غم و اندیشہ ہو تو اس سے اکراہِ ناقص ثابت ہو گا۔[2]

تشریح:۔ اس شق میں غم سے مراد وہ غم ہے جو اضطرار کو واجب نہ کرتا ہو۔ یعنی قتل، قطع یا کل مال کے تلف کے غم سے کم درجہ کا ہو مثلاً معمولی مار۔ پٹائی وغیرہ۔ اس طرح کا غم رضا کو تو معدوم کر دیتا ہے مگر اختیار کو معدوم نہیں کرتا۔[3]

۴۔ جبر سے قبل مجبور اس فعل کو ممنوع سمجھتا ہو جس کے ارتکاب کا جابر نے اس سے مطالبہ کیا ہے۔[4]

دفعہ ۱۳

ا۔ کسی معین شخص کے قتل پر اگر کسی آدمی کو اکراہِ تام کے طور پر مجبور کیا گیا ہو جس پر اُس نے قتل کا ارتکاب کر دیا تو جابر سے اس کا قصاص لیا جائے گا۔ بشرطیکہ قتل عمداً ہو اور جابر مکلف ہو اور مجبور کو تعزیری سزا دی جائے گی۔[5]

ب۔ اگر جابر غیر مکلف ہو یعنی نابالغ، مجنون یا مدہوش میں سے کوئی ہو تو اس کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی عاقلہ پر تین سال میں دیت واجب الادا ہو گی۔[6]

---

[1] الدر المختار جلد ۵ ص ۸۳ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] الدر المختار جلد ۵ ص ۸۸

[5] ایضاً و ہدایہ جلد ۳ ص ۳۴۹۔ و بدائع جلد ۷ ص ۱۷۹۔

[6] البحر جلد ۸ ص ۸۰ و شامی جلد ۵ ص ۸۸۔

تشریح ما :۔

اکراہ کے احکام کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ یہ کہ اکراہ کی وجہ سے مطلوبہ فعل کے ارتکاب کی رخصت ہو اور عدم ارتکاب پر مجبور مستحقِ ثواب ہو[1] جیسے کسی شخص کو اکراہ تام کے طور پر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں کلمۂ کفر کی حرمت میں تو کوئی تغیر نہ ہوگا۔ البتہ مجبور اگر زبان سے ادا کرے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو[2] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔

"یعنی جو شخص ایمان قبول کرنے کے بعد اللہ کا منکر ہوا، مگر وہ نہیں جس پر جبر ہوا اس کا دل ایمان پر قائم ہے"۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ کفر کی ادائیگی کی رخصت دی تھی کیونکہ ان کا دل ایمان پر مطمئن تھا[3] البتہ افضل یہ ہے کہ کلمۂ کفر ادا نہ کرے۔ اس پر اگر مارا جائے تو ماجور ہوگا[4] جیسا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو کفر اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا تھا مگر انہوں نے زبان سے بھی کلمۂ کفر ادا نہ کیا بلکہ جابر کے مصائب کو صبر سے برداشت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ قتل ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سید الشہداءؓ کا لقب دیا تھا۔

۲۔ فعل کا ارتکاب مباح ہو اور عدم ارتکاب قابلِ مواخذہ ہو بشرطیکہ اکراہ تام ہو، جیسے دم مسفوح۔ شربِ خمر، خنزیر اور مُردار کے گوشت کھانے پر کسی کو مجبور کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ

---

[1] البحر جلد ۸ ص ۸۲

[2] البدائع جلد ۷ ص ۱۷۶

[3] البدائع جلد ۷ ص ۱۷۷ [4] ایضاً

اِلَیۡہِ۔ (الانعام)

(اور اللہ واضح کر چکا تم پر جو کچھ حرام کیا ہے مگر جس وقت ناچار ہو اس کی طرف سے)

اس آیت میں حرمت کے حکم کو حالت اضطرار کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جس کا حاصل اباحت ہے۔ اگر مجبور شخص اس صورت میں اباحت پر عمل نہ کرے تو گنہگار ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہوگا، جس کی ممانعت اس آیت میں موجود ہے۔

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ۔ یعنی اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اگر اکراہ ناقص ہو تو ان امور کا ارتکاب مباح نہ ہوگا۔ اور نہ ہی ان میں رخصت ہوگی[1]

۳۔ یہ کہ فعل کا ارتکاب نہ مباح ہو اور نہ اس کی رخصت ہو بلکہ حسب حال حرام ہو۔ خواہ اکراہ تام ہو یا ناقص۔

اس قسم کا تعلق اکل و شرب سے متعلقہ افعال سے نہیں ہے بلکہ قتل، قطع اور مہلک ضرب وغیرہ جرائم سے ہوتا ہے[2]۔ جیسے کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا، یا اس کا کوئی عضو قطع کرنا یا اس کو مہلک مار دینا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ (الانعام)

(اور نہ مار ڈالو جان جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر حق پر)

نیز یہ کہ:۔

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا بُہۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِیۡنًا (الاحزاب)

(اور جو لوگ ستاتے ہیں مسلمان مردوں کو اور مسلمان عورتوں کو بغیر کسی جرم کیے تو انہوں نے جھوٹ کا بوجھ اٹھایا اور صریح گناہ کا)

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ ناحق قتل کرنا یا کوئی دوسری تکلیف دینا ممنوع ہے۔

---

[1] البدائع جلد ۷ ص ۱۷۶

[2] البحر جلد ۸ ص ۷۴، ۷۵

تشریح ۲:- اگر اکراہ جرائم کے ارتکاب پر کیا جائے مثلاً قتل، قطع وغیرہ پر تو مجبور کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ آمر کے حکم کی تعمیل کرے کیونکہ اپنی جان یا کسی عضو کو بچانے کی خاطر دوسرے کی جان یا عضو کو تلف کرنا حرام ہے جیسا کہ آیات متذکرہ سے واضح ہے۔ ایسی صورت میں مجبور کو عزیمت پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر اُس کو نقصان پہنچ جائے تو ماجور ہوگا۔ مگر یہ اس کا حکم اخروی ہے۔ اور دنیاوی احکام میں مجبور سے اتنی رعایت کی جائے گی کہ اس کو اس جرم کی سزا نہ دی جائے جس کے ارتکاب میں اس کو مجبور کیا گیا تھا۔ بشرطیکہ مجبور جابر کا آلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اکراہ تام ہو۔ ایسی صورت میں فعل کی نسبت جابر کی طرف ہو گی اور فعل کی سزا اسی کو دی جائے گی البتہ مجبور کو بالکل بری الذمہ تصور نہ کیا جائے گا۔ بلکہ عزیمت پر یعنی فعل کے ترک پر، عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو تعزیری سزا دی جائے گی[1]

درحقیقت اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ مذکورہ حکم امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے موقف کے مطابق ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک جابر اور مجبور دونوں کو قتل کے جرم کرنے پر قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اور احناف میں سے امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ دونوں پر قصاص نہ ہوگا۔ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ صرف مجبور پر قصاص ہوگا[2]

امام شافعیؒ دلیل دیتے ہیں کہ قتل ایسے فعل کا نام ہے جس سے حیات منقطع ہو جائے اور یہ فعل جابر اور مجبور دونوں سے صادر ہوا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جابر سے بالواسطہ اور مجبور سے بلاواسطہ صادر ہوا ہے۔ ان کے نزدیک اصول یہ ہے کہ اگر سبب تام ہو تو وہ حق قصاص میں بمنزلہ مباشر کے ہوتا ہے[3] لہٰذا جابر اور مجبور دونوں سے قصاص لیا جائے گا۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ فعل کا صدور حقیقتاً، حساً اور مشاہدۃً مجبور ہی سے صادر ہوا ہے لہٰذا قصاص بھی مجبور سے لیا جائے گا[4]

امام ابویوسف دلیل دیتے ہیں کہ طرفین میں شبہ واقع ہو گیا ہے اس لیے قصاص جابر اور مجبور دونوں سے ساقط ہوگا۔ شبہ جابر کی جانب میں یہ ہے کہ فعل درحقیقت اس سے صادر نہیں ہوا،

---

[1] البدائع جلد ۷ ص ۱۷۹ — [2] ہدایہ جلد ۳ ص ۳

[3] ایضاً ص ۳۵۰ حاشیہ ۱ — [4] ایضاً ص ۳۴۹

لہٰذا اس کو قصاص کی سزا بھی دینی درست نہیں ہے، اور مجبور کی جانب شبہ یہ ہے کہ اس نے رضا سے جرم نہیں کیا بلکہ وہ مجبور اور مضطرب تھا[۱]۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے "عفون عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ"۔ یعنی میں نے اپنی امت سے خطا اور نسیان کو معاف کر دیا ہے اور اس چیز کو بھی معاف کر دیا ہے جس پر کسی کو جبر کیا گیا ہو۔

اس حدیث میں لفظ "عفو" کا ذکر ہے اور عفو کا تحقق اسی صورت میں ہوگا جب کہ پہلے کوئی چیز واجب ہو چکی ہو۔ اور مجبور نے چونکہ مجبوری کی وجہ سے فعل ناحق کا ارتکاب پہلے کر دیا ہے اس لیے اب اس سے عفو کے معنی یہی ہیں کہ اس سے اس فعل کی سزا ساقط ہوگی اور صورۃً قتل اگرچہ مجبور سے ہی واقع ہوا ہے مگر حقیقۃً مجبور، محض جابر کا آلہ قتل تھا لہٰذا قتل کی نسبت جابر کی طرف ہی ہوگی[۲]۔

دفعہ ۱۳ ج۔

مجبور، مقتول مورث کی میراث سے محروم نہ ہوگا[۳]۔

د۔ جابر، مقتول کی میراث سے محروم ہوگا۔ بشرطیکہ وہ مکلف ہو۔ اگر وہ نابالغ ہو تو محروم نہ ہوگا[۴]۔

تشریح:۔ فقہاء احناف میں سے امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ مجبور شخص کو مقتول مورث سے وراثت نہیں ملے گی۔ یہی مذہب امام شافعیؒ کا بھی ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہؒ اور ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مجبور شخص کو میراث ملے گی۔ یہ اختلاف درحقیقت اسی مذکورہ اختلاف پر مبنی ہے کہ فعل کی نسبت جابر کی طرف ہوگی یا نہیں۔

جابر شخص مورث کے ترکہ سے امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک محروم ہوگا۔ جبکہ امام ابویوسفؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک محروم نہ ہوگا[۵]۔ یہ اختلاف بھی مذکورہ اختلاف پر ہی مبنی ہوگا۔ (باقی)

---

[۱] البدائع جلد ۷، ص ۱۸۰ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً

امام المحدثین حضرت امام بخاریؒ

جناب پروفیسر عبد المنان صاحب

(۲)

اخلاق وعادات ومعاشرت امام بخاری کے والد محترم اسماعیل بہت بڑے تاجر تھے لیکن تجارت ہر قسم کی بے احتیاطیوں سے پاک تھی حتیٰ کہ انہوں نے ابوحفص اپنے شاگرد سے بوقت وفات فرمایا۔

"میں اپنے مال میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں پاتا"

ابوحفص یہ سوچ کر چونک اٹھے۔ یہ اس امر کی دلالت ہے کہ انہوں نے معمول سے زیادہ خاص احتیاط فرمائی۔ اور ان کا غالباً وفات کے وقت یہ کہنا اس غرض سے ہو، کہ ان کا وارث جو آئندہ کا امام المحدثین بننے والا تھا اس مال کو مشتبہ خیال کر کے اس سے دستبردار نہ ہو، بلکہ مشکلات میں اس مال سے کام لے کہ یہ مال بالکل طیب وطاہر ہے۔

محمد بن حاتم کہتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنے سب مال کو مضاربت میں لگا دیا تھا اور مزاج میں انتہا درجہ کی مروت اور رحم دلی تھی۔

ایک مُضارِب کو پچیس ہزار درہم دیے لیکن اس نے منافع کا کچھ حصہ نہ دیا اور بخارا چھوڑ کر آمل چلا گیا تو بعض تلامذہ نے عرض کیا کہ مقروض آمل پہنچ گیا ہے، اس سے روپیہ وصول کر لیں۔ فرمایا ہمیں مناسب نہیں کہ قرض دار کو پریشان کریں۔ مقروض کو اس تحریک کی خبر ملی تو وہ خوارزم چلا گیا۔ ہم نے کہا کہ اب بھی کچھ دور نہیں، گورنر سے خوارزم کے حاکم کے نام خط لے لیجئے تو فرمانے لگے "میں حکومت سے ایک خط کا طمع کر دوں گا تو حکومت میرے دین میں طمع کرے گی"۔ تاہم امام صاحب کے بہی خواہوں نے ایک خط آمل کے گورنر سے لکھوا کر مقروض کو گرفتار کرانا چاہا۔ امام بخاری کو خبر ہوئی تو فرمایا "مجھ

سے زیادہ میرے خیر خواہ نہ ہو" اور ایک خط خوارزم میں کسی شاگرد کو لکھا کہ مقروض سے کچھ تعرض نہ کرو۔ مقروض خوارزم کو چھوڑ کر مرو پہنچا، تو دوسرے تاجروں سے اس کا سامنا ہو گیا اور حکومت کو بھی اس معاملہ کی خبر ہو گئی اور اس سے سختی کی گئی۔ تو امام بخاری کو بڑا افسوس ہوا اور بادلِ نخواستہ اس مقروض سے طے کیا کہ ۵۰۰۰ میں سے سالانہ دس درہم ادا کر دیا کرے۔ اس طرح اس قرض کا انجام یہ ہوا کہ امام صاحب کو پچیس ہزار درہم میں سے کچھ بھی وصول نہ ہوا۔

ابوحفص امام بخاری کے والد کے شاگرد خاص تھے۔ انہوں نے امام بخاری کی خدمت میں کچھ مال بھیجا۔ بعض تاجروں نے شام کو (۵۰۰۰) پانچ ہزار منافع دیکر مال خریدنا چاہا۔ امام صاحب نے فرمایا۔ تشریف لے جائیں۔ کل صبح بات ہو گی۔ صبح دوسرے تاجر پہنچے۔ انہوں نے دس ہزار نفع دے کر خریدنا چاہا۔ تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے بوقتِ شب جو تاجر آیا تھا مال اس کو دینے کی نیت کر لی تھی۔

عبداللہ بن محمد صارمی فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ امام صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ وہ اپنے مسودات لکھ رہے تھے۔ آپ کی لونڈی آئی۔ اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے دوات الٹ گئی اور روشنائی گر گئی تو امام صاحب نے غصے سے فرمایا۔

كَيْفَ تَمْشِيْنَ۔ (تو کیسے چلتی ہے)

شوخ لونڈی نے جواب دیا۔

إِذَا لَمْ يَكُنْ طَرِيْقًا كَيْفَ أَمْشِيْ (راستہ نہ ہو تو کیونکر چلوں)

امام صاحب نے بجائے غضبناک ہونے کے فرمایا۔

"جا میں نے تجھے آزاد کر دیا"

میں نے عرض کیا۔ "أَغْضَبَتْكَ يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ"

تو فرمایا۔ أَرْضَيْتُ نَفْسِيْ بِمَا فَعَلَتْ۔

تو گویا امام صاحب نے لونڈی کو تنبیہ کرنے کی بجائے اپنے نفس کو تنبیہ کی۔

امام بخاری فرمایا کرتے تھے۔ مَا اغْتَبْتُ مُنْذُ عَلِمْتُ أَنَّ الْغِيْبَةَ حَرَامٌ۔

اور فرمایا کرتے تھے۔ "مجھے امید ہے کہ اس بارہ میں قیامت کے دن میرا کوئی مدعی مخالف نہ ہو گا

اتباع سنت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جس قدر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال اور تقریرات کے شیدا و شیفتہ تھے اس کا اندازہ خارج از قیاس ہے۔ صحابہ کی صحبت تابعین نے پائی وہ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ ان میں بھی صحابہ کی طرح وہی گرویدگی اور شیفتگی تھی جو انہوں نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھی۔ اور یہ سلسلہ محدثین رحمہم اللہ تک پہنچا ہے۔ مثلاً امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

مَا قرأتُ حدیثاً اِلّا عَمِلتُ بِهٖ حتیٰ مَرَّبِیْ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اِحْتَجَمَ واعطی الحجام دینارًا فاحْتَجَمْتُ وَ اَعْطَیْتُ الحجام دینارًا۔

امام وکیع جو جلیل القدر محدث ہیں فرماتے ہیں۔

اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَحْفَظَ حَدِیْثًا فَاَعْمَلْ بِهٖ۔

اسی طرح باوجودیکہ تیر اندازی ایک محدث کا فن نہیں ہے لیکن اس لئے کہ تیر اندازی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، امام بخاری بھی تیر اندازی کے لئے سوار ہو کر میدان میں جاتے اور تیر اندازی فرماتے۔ اور اس فن میں اس حد تک مشّاق ہو گئے تھے کہ آپ کا تیر نشانہ خطا نہیں کرتا تھا۔

محمد بن حاتم وراق کہتے ہیں کہ میں نے آپ کا تیر نشانہ سے خطا ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک دفعہ ---- تیر اندازی کے لئے نکلے ---- اور تیر اندازی کی مشق فرمائی تو آپ کا ایک تیر ایک پل پر جا لگا جس سے پل کو نقصان پہنچا۔

بے تاج بادشاہ علامہ سخاویؒ نے فرمایا "آپ مجتہد مطلق تھے" امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں "آپ فقہ کے امام تھے۔ آپ کے استاد احمد بن اسحاق سرماری فرماتے ہیں۔ جو سچ مچ فقیہ کو دیکھنا چاہے۔ وہ محمد بن اسماعیل بخاری کو دیکھے۔ امام اسحاق بن راہویہ نے کہا "محمد بن اسمٰعیل بخاری مجھ سے زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ قتیبہ نے کہا "مجھے بڑے بڑے فقیہ، محدث، زاہد اور عابد لوگوں سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ لیکن امام بخاریؒ ایسا جامع کمالات کسی کو نہ پایا۔ آپ اپنے زمانہ میں ایسے ہی محترم تھے جیسے صحابہ میں حضرت عمرؓ۔

شعبہ نے کہا میں نے آپ کی مثل کوئی نہیں دیکھا۔ لوگوں کے دل میں آپ اتنے محترم تھے گویا آپ ان کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ امام بخاریؒ نیشاپور میں تشریف لے گئے تو لوگوں نے فقید المثال استقبال کیا۔ اہل شہر ہزاروں کی تعداد میں کئی میل آگے استقبال کو آئے۔ جن میں چار ہزار گھوڑ سوار ہی تھے۔ امام مسلم فرماتے ہیں "میں نے ایسی شان و شوکت کسی بادشاہ کی نہیں دیکھی" عبداللہ بن حماد بلی آپ کی عظمت و شوکت اور جمال و کمال سے اس حد تک متاثر تھے کہ فرمایا کرتے تھے۔ "کاش میں محمد بن اسمٰعیل بخاری کے جسم کا ایک بال ہی ہوتا۔"

تصنیف و تالیف امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے کئی مفید کتابیں لکھیں۔ جن میں اکثر آج نایاب ہیں۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب "الجامع الصحیح" المعروف صحیح بخاری ہے۔ صحیح بخاری کا نام جو امام بخاری نے خود تجویز کیا ہے وہ یہ ہے۔

"الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ"

یعنی صحیح اور مرفوع احادیث قول و فعلی اور وقائع زندگی کا مجموعہ۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے نام میں ہی ایک طرح حدیث کی تعریف کر دی ہے۔ گویا امام بخاری کے نزدیک حدیث ان تمام امور کو حاوی ہے جن کو کسی نہ کسی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہے اور ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا۔ یعنی حدیث اس عہد مبارک کی تاریخ ہے جس میں سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم المرتبت ہستی قدرت کی جانب سے عالم انسانیت کو عطا ہوئی۔

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی تمام تصنیفات و تالیفات میں "الجامع الصحیح" وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس نے پوری اسلامی دنیا کو متاثر کیا۔ اس کتاب نے آپ کو لافانی شہرت اور غیر متناہی عظمت بخشی۔ یہی آپ کا وہ شاہکار ہے جس نے آپ کے نام کو قیامت تک کے لئے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اور پوری امت مسلمہ آپ کی شکر گزار ہے۔

تالیف بخاری کا سبب امام بخاریؒ سے پہلے اگرچہ تدوینِ حدیث کا کام شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ان کتابوں میں صحیح حسن اور ضعیف سب قسم کی حدثیں شامل ہو گئیں تھیں۔ اس لئے آپ کے دل میں یہ تڑپ تھی کہ احادیث کی ایک جامع اور مستند دستاویز مرتب ہو جائے۔

محمد بن سلیمان بن فارسی نے بیان کیا: "میں نے امام بخاریؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس سے میں مکھیاں اڑا رہا ہوں۔ بعض تعبیر دینے والوں نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب شدہ روایتوں کی تردید کریں گے۔

پھر ایک بار امام بخاریؒ شیخ اسحاق بن راہویہ کے پاس بیٹھے تھے کہ انہوں نے فرمائش کی۔ "کاش تم کوئی ایسی مختصر کتاب جمع کرو۔ جس میں صرف صحیح صحیح حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوں"۔ امام بخاریؒ کی اپنی بھی خواہش تھی کہ ایسا مجموعہ احادیث ہو جس میں پوری تحقیق و تدقیق اور تنقید و تنقیح کے بعد احادیث جمع کی جائیں اس لئے شیخ موصوف کی فرمائش پر آپ جامع صحیح کی تدوین میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

تالیف بخاری کا طریقہ اس کتاب کی تالیف کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بلکہ یہ کام سخت محنت کا طالب تھا۔ لیکن امام بخاریؒ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ارشادات کے بارے میں جو محبت پیدا کر دی تھی اس کے سامنے یہ محنت کچھ نہ تھی چنانچہ یہ کام امام المحدثین ہی کو جچتا تھا۔ انہوں نے یہ کام کیا اور حق ادا کر دیا۔ دوسرے مصنفین کے برعکس آپ نے شرائط اتنی کڑی رکھیں کہ پھر خطا کا احتمال نہ رہا۔ پھر بھی نہیں بلکہ یہاں تک اہتمام فرمایا کہ ہر حدیث درج کرنے سے پہلے آپ نے باقاعدہ غسل کیا۔ دو رکعت نماز ادا کی اور استخارہ کیا۔ سولہ سال میں بخاری شریف کو مکمل کیا۔ تین مرتبہ اس کی تالیف کی۔ جن میں سے ایک دفعہ حرم شریف میں اور دوسری دفعہ منبر و محراب نبوی کے درمیان بیٹھ کر۔ آپ کے پیش نظر چھ لاکھ حدیثیں تھیں جن میں سے تقریباً سات ہزار کا انتخاب کیا۔ الجامع الصحیح میں جن صحابہ کرامؓ کی روایات مندرج ہیں صرف ان صحابہؓ کی تعداد سات سو اکسٹھ ۷۶۱ ہے۔

صحیح بخاری کی تکمیل کے بعد آپ نے وقت کے مانے ہوئے شیوخ کے سامنے اس کتاب کو پیش کیا۔ یعنی امام ابن حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، اور علی بن المدینیؒ وغیرہم۔ سب نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور بالاتفاق گواہی دی کہ اس میں سب حدیثیں صحیح ہیں۔ مگر چار حدیثوں میں گفتگو کی۔ لیکن عقیلی نے کہا ان میں بھی امام بخاری کی بات درست نکلی۔ الجامع الصحیح کی ...

اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پوری دنیائے اسلام کے اہلِ سنت صحت کے اعتبار سے اس کتاب کو قرآن مجید کے بعد درجہ دیتے چلے آئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ اس کتاب کی کل احادیث صحیح ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا، بخاری و مسلم کی تمام متصل احادیث کے قطعًا صحیح اور متواتر ہونے پر سب محدثین کا اتفاق ہے۔ جو اِن کی شان میں کمی کرے گا وہ بدعتی اور مومنوں کے راستہ سے الگ ہے

فنِ رجال فنِ رجال کی بنیاد یحییٰ بن سعید قطان نے رکھی۔ لیکن تاریخ کبیر، تاریخ اوسط اور تاریخ صغیر لکھ کر امام بخاریؒ نے اس فن کو اَوج کمال تک پہنچا دیا۔ ہزارہا راویوں کے متعلق آپ کو زبانی یاد تھا کہ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کیا ہے۔ کہاں کے باشندے تھے۔ باپ دادا کون اور کس خاندان سے تھے۔ یاداشت کیسی تھی اور وہ کس قسم کے خیالات و اخلاق کے مالک تھے۔ جھوٹ بولنے کے عادی تو نہ تھے۔ یا یہ کہ وہ اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے جھوٹی روایتیں تو نہیں وضع کیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد آپ نے بخاری شریف کی ابتدا کی۔ رجال پر آپ کی رائے قولِ فیصل ہوتی۔

بخاری شریف کی شروح تمام علومِ اسلامیہ پر حاوی ہونے کی وجہ سے عربی اور فارسی میں بخاری شریف کی سینکڑوں شروح و حواشی لکھی گئیں۔ اس کے باوجود ابن خلدون نے کہا "بخاری ابھی تک امت پر قرض ہے۔" اور جب علامہ ابن حجر عسقلانی کی معروف شرح فتح الباری لکھی گئی تو علامہ سخاوی نے فرمایا۔ "اگر اب ابن خلدون فتح الباری دیکھ لیتے تو محسوس کرتے کہ قرض ادا ہو گیا۔"

امام بخاریؒ کی صحیح بخاری کے علاوہ دیگر مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔

الادب المفرد۔ رفع الیدین۔ القرأۃ خلف الامام۔ بر الوالدین۔ خلق العباد۔ کتاب الضعفاء۔ کتاب الاشربہ۔ کتاب الوحدان۔ اسامی الصحابہ۔ الجامع الکبیر۔ المسند الکبیر۔ تاریخ کبیر۔ تاریخ اوسط۔ تاریخ صغیر وغیرہ۔

امام بخاریؒ کو شعر و شاعری سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ امام ابو عبداللہ محمد حاکم (صاحب مستدرک) نے اپنی کتاب میں ان کے مندرجہ ذیل دو شعر رقم کئے ہیں۔

اِغْتَنِمْ فِي الْفَرَاغِ فَضْلَ رَكُوعٍ
فَعَسَىٰ اَنْ يَكُوْنَ مَوْتُكَ بَغْتَةً
كَمْ صَحِيْحٍ رَأَيْتُ مِنْ غَيْرِ سُقْمٍ
ذَهَبَتْ نَفْسُهُ الصَّحِيْحَةُ فَلْتَةً

(فراغت میں رکوع وسجود کو غنیمت جان ۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک موت آجائے ۔میں نے کتنے ہی تندرست و توانا ایسے دیکھے ہیں کہ اُن کی جان دفعتہً جاتی رہی ۔)

مراجعتِ بخارا امام بخاریؒ مکہ معظمہ کے طویل قیام اور دیگر علاقوں کے سفرِ دراز کے بعد اپنے وطن بخارا میں مراجعت فرما ہوئے تو ہر خاص و عام نے اس خوشی میں اُن کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ احمد بن منصور شیرازی نے بیان کیا۔ کہ جب امام بخاریؒ بخارا کو لوٹے تو شہر سے تین میل کے فاصلے پر ان کے استقبال کے لئے خیمے نصب کئے گئے ۔ اور لوگوں نے ان کا استقبال کیا ۔حتیٰ کہ کوئی مشہور آدمی ایسا نہ رہا جو اُن کے استقبال کو نہ گیا ہو ۔ امراء نے اِس موقعے پر اس قدر مسرت کا اظہار کیا کہ ان پر دینار اور درہم نچھاور کئے گئے ۔

ترکِ وطن اِس مراجعت کے بعد آپ ایک مدت تک بخارا میں مقیم رہے ۔ اور یہاں وعظ و درس کا سلسلہ جاری فرمایا ۔پھر خالد بن احمد ذہلی امیر بخارا سے ناچاقی ہوئی اور یہی ناچاقی ترکِ وطن کا سبب ہوئی۔ غنجار نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے ۔ میں نے احمد بن محمد بن عمر سے سنا اور انہوں نے بکر بن منیر سے سنا کہ خالد بن احمد ذہلی امیر بخارا نے امام بخاری کو کہلا بھیجا ۔ کہ تم میرے پاس کتاب الجامع اور تاریخ لے کر آؤ ۔ تاکہ میں ان کو تم سے سنوں ۔ امام بخاریؒ نے قاصد سے کہا کہ امیر سے کہہ دینا کہ میں علم کو ذلیل نہیں کرتا ۔ اور سلاطین کے دروازوں پر نہیں جاتا ۔ اگر اس کو علم حاصل کرنا ہے تو میرے گھر یا مسجد میں آئے ۔

اس موقع پر امیر کے بعض نادان دوستوں نے امام بخاریؒ پر غرور اور اہانت امیر کا الزام لگا کر امیر مذکور کو ان کے خلاف برانگیختہ کر دیا ۔ امیر نے حریث بن ابی ورقاء وغیرہ کئی شخصوں کو بہکایا ۔ انہوں نے امام بخاری کے مذہب میں گفتگو کی ۔ آخر امیر نے امام بخاریؒ کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ۔ امام بخاریؒ نے ان کے حق میں بد دعا کی ” یا اللہ جو انہوں نے میرے لئے چاہا وہ خود

ان کو اور ان کی اولاد کو پیش آئے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ امیر بخارا خالد کو ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ امیر طاہر نے معزول کر دیا اور گدھے پر سوار کر کے پھرایا گیا اور قید کیا گیا۔ اور حریث بن ابی ورقاء کو اپنے گھر والوں میں وہ مصیبت پیش آئی۔ جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس کے ساتھی بھی طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں میں مبتلا ہوئے۔

سفرِ آخرت ابن عدی نے عبد القدوس بن عبد الجبار سے روایت کیا۔ کہ امام بخاریؒ سمرقند کے ایک گاؤں خرتنگ کو گئے وہاں ان کے اقرباء تھے۔ خرتنگ آجانے کے بعد وہ دنیا سے دل برداشتہ ہو گئے اور زیادہ وقت عبادت ہی میں گزارتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہاں ایک رات تہجد کی نماز کے بعد انہوں نے یہ دعا مانگی۔

"یا اللہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ تیری زمین کشادگی کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی ہے۔"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اسی ماہ عید الفطر کی شب کو ۲۵۶ ہجری میں باسٹھ سال کی عمر پا کر اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ان کے انتقال پر ملال سے علمی و مذہبی دنیا کا ایک ماہ درخشاں ہمیشہ کے لئے موت کے بادلوں میں چھپ گیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ مجھے تین کپڑوں میں کفن دینا۔ جن میں نہ قمیص ہو نہ عمامہ۔ (یہی سنت ہے اور قمیص اور عمامہ دونوں بدعت ہیں) چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق انہیں کفن دیا گیا۔

محمد بن ابی حاتم وراق نے غالب بن جبریل سے روایت کیا۔ کہ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو کفن میں لپیٹا اور نماز جنازہ سے فارغ ہو کر قبر میں رکھا تو ان کی قبر سے عنبر و مشک کی طرح خوشبو نکل کر پھیل گئی۔ اور بہت دنوں تک یہ خوشبو باقی رہی۔ لوگ دور دراز سے یہ خوشبودار مٹی حاصل کرنے کے لئے آنے لگے۔ آخر ہم نے ان کی قبر کے گرد لکڑی کا جال بنا دیا۔

خطیب نے کہا مجھ کو خبر دی علی بن ابی حامد نے، انہوں نے روایت کیا محمد بن محمد ابن مکی سے، انہوں نے بیان کیا کہ میں نے عبد الواحد بن آدم طواویسی سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے جواب دیا۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ

آپؐ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "محمد بن اسمٰعیل کا انتظار کر رہا ہوں"۔ چند روز کے بعد جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی خبر آئی۔ اور میں نے غور کیا تو امام بخاریؒ اسی وقت فوت ہوئے تھے جب میں نے یہ خواب دیکھا تھا۔

یحییٰ بن جعفر بیکندی نے فرمایا۔

امام بخاری کی موت علم کی موت ہے۔ واقعی آپ دنیا کے عظیم ترین انسان تھے۔ آپ خدا کی روشنی تھے۔ جس نے ایک عالم کو منور کر دیا تھا۔

روحانی اولاد | آپ کی جسمانی اولاد نہ تھی۔ لیکن دنیا میں کروڑوں اہل سنت آپ کی روحانی اولاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے شاگردان رشید امام مسلم، امام نسائی، امام ترمذی اور امام دارمی یہ سب آپ کے روحانی بیٹے ہی تو تھے۔

قارئین توجہ فرمائیں

ماہنامہ ترجمان القرآن کی خریداری یا چندے وغیرہ سے متعلق خط و کتابت کرتے ہوئے اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے ورنہ تعمیل میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ براہ کرم خریداری نمبر ترجمان القرآن کے کسی بھی موصولہ شمارے کے ریپر سے اپنی ڈائری پر مستقلاً نقل کر لیں۔

مینجر

تعلیم کا تہذیبی نظریہ اور ہم

جناب نعیم صدیقی صاحب

تعلیم کیا ہے ؟

وہ عمل جس کے ذریعے ایک نسل اپنی حاصل کردہ معلومات، تجربات، عملی مہارتوں اور اپنے عقیدہ و اطوار کو نوخیز نسل کی طرف منتقل کرتی ہے۔

پہلے اس عمل کا زیادہ تر حصہ گھروں کے دائروں میں تکمیل پاتا تھا، ماں کی گود اور باپ کے فیضانِ نظر کا مکتب اکتفا کرتا تھا۔ پھر یہ عمل قبیلے یا دیہی کمیونٹی تک وسیع ہوگیا۔ بعد میں جب انسانی معلومات اور تجربات کا پھیلاؤ بڑھ گیا تو باقاعدہ مکتب و مدرسہ کے ادارے وجود میں آگئے۔ اور اب جب کہ شاخ در شاخ علوم کی پہنائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر شاخ بجائے خود چمن بداماں ہے، تعلیم کا عمل یونیورسٹیوں اور جامعات و کلیات کے بھاری بھرکم نظام کا منت کش ہوگیا ہے۔

زمانہ کوئی بھی ہو، معاشرہ کسی بھی سطح کا ہو، تعلیم کے دائرے کا پھیلاؤ کم ہو یا زیادہ، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن، جسم، ماحول اور اشیاء کے متعلق معلومات و تجربات کے انبار کو بھلے برے، مفید و مضر اور صحیح اور غیر صحیح کی چھنٹائی کئے بغیر ایک زمانے کے لوگ اپنے اخلاف کے حوالے کردیں۔ بلکہ اس فطری تقاضے کے تحت جس کے اثر سے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کی کج فکریوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بچ کر زیادہ بہتر انسان ثابت ہوں، تعلیم کے عمل میں یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ناقص معلومات و تجربات، حقائق کے

کے غلط تصورات اور انسانی اطوار کے ناپسندیدہ اجزا کو چھانٹ کر بہترین مواد کو آئندہ نسلوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح ہر نسل یا ہر دَور کی طرف سے کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ صرف اس سرمایۂ علم کی آگے ترسیل کی جائے جو زیادہ سے زیادہ قرینِ حقیقت اور ذریعۂ افادیت ہو۔ ورنہ اگر سارے رطب و یابس کو اکٹھا کر کے شروع سے منتقل کیا جاتا تو آج ہر طالب علم کے ساتھ نصابیات کا پورا ایک انبارِ خر ہوتا اور کسی استاد کا دماغ تدریسی مواد کا گودام بننے کے قابل نہ ہوتا۔

تعلیمی عمل کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ معلومات و تجربات کو متفرق اور پراگندہ صورت میں منتقل نہیں کیا جاتا، بلکہ سارے مواد کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترتیب جس مرکز کے گرد واقع ہوتی ہے وہ کسی معاشرے کے عقیدے، مقصد اور انسانِ مطلوب کے تصور سے بنتا ہے۔ یہی تین چیزیں اس کسوٹی کی تشکیل بھی کرتی ہیں جس سے تعلیمی مواد کو پرکھ کر خس و خاشاک کو الگ کیا جاتا ہے اور ذراتِ زر اور پارۂ ہائے جواہر کو اگلی نسلوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کبھی کوئی نظامِ تعلیم ایسا نہیں پایا گیا جو کائنات و حیات کے متعلق کچھ اساسی معتقدات نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہر قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصدِ وجود ہوتا ہے ___ خواہ وہ لوٹ مار ہو یا نوعِ انسانی کی خدمت۔ اور ان دو بنیادی حقیقتوں کا لازمہ انسانِ مطلوب کا ایک تصور ہے۔ ہر معاشرہ اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ساری معلومات اور سارے تجربات کو نہ صرف اپنے اس بنیادی سرمایۂ شعور کے گرد مرتب کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس بنیادی سرمایۂ شعور کو تعلیمی عمل میں بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

اسی بنیادی سرمایۂ شعور سے ہر معاشرے کا کلچر بنتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ساری تہذیب تشکیل پاتی ہے۔ اس کلچر یا تہذیب کو تعلیم کے ذریعے ہر نسل دوسری نسل کی طرف بڑی احتیاط اور بڑی سرگرمی سے منتقل کرتی ہے۔ اسی تہذیب کے مطابق اس کی اجتماعیت بنتی ہے، اسی کے مطابق اس کا نشنل ٹائپ بنتا ہے، اسی کے مطابق اس کا نظامِ اقدار، اس کا سلسلۂ اطوار اور اس کا تصورِ کردار نمودار ہوتا ہے۔ پس اگر وہ اپنے امتیازی تہذیبی شعور کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے میں کوتاہی کرے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اخلاف اپنے تہذیبی وجود کو کھو بیٹھیں۔ اپنا مقصد گم کر دیں، اپنے تصورِ کردار سے محروم ہو جائیں، اپنے معتقدات کی عمل انگیز رُوح کو ضائع کر دیں، اور اپنی اجتماعیت کی شکست و ریخت کا تماشا کریں۔

پس میں جس تہذیبی نظریۂ تعلیم پر گفتگو کر رہا ہوں، اس کے لحاظ سے اوّلیت اس امر کو حاصل ہے کہ پورے نظامِ تعلیم میں اس تہذیبی شعور اور تجربے کو اوّلیت اور غلبہ حاصل ہونا چاہیے جس کے بل پر کوئی قوم قائم ہے اور جس کی تحریک ہی سے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر مزاحم قوتوں کے ہر چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہوتی ہے۔

تہذیبی نظریۂ تعلیم پر غور کرتے ہوئے ہمیں خود اپنے بارے میں سوچنا چاہیے کہ ہمارا امتیازی تہذیبی وجود کیا ہے، کیسے بنتا ہے اور اس کی بنا کیا ہے؟

کائنات و حیات کی حقیقت سے لے کر تاریخ کے قانونِ عروج و زوال تک انسان نے مختلف اَدوار میں جو فلسفیانہ افکار سمیٹے ہیں، وہ حواس و قیاس کی دی ہوئی محدود معلومات پر مبنی ہیں۔ یہ معلومات نت بدلتی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہیں، اسی وجہ سے یہ گمان تو دے سکتی ہیں، ایمان نہیں دے سکتیں۔ دُنیا کی بہت سی مذہبی اور عقلی قوموں نے گمان پر ضروری عقیدے کھڑے کیے ہیں، کیونکہ ان کے بغیر زندگی ایک قدم نہیں چل سکتی۔ بخلاف ایسی ملحد یا مشرک قوموں کے، کائنات و حیات اور تاریخ انسانی کے متعلق ہمارا شعور، پیغمبروں کے عطا کردہ علمِ وحی پر مبنی ہے جس کی صحت کا بڑا ٹسٹ یہ ہے کہ مختلف زمانوں اور حالات میں آنے والے تمام انبیا نے بنیادی حقیقتوں کا ایک ہی تصوّر دلایا ہے، اُن میں اختلاف نہیں پایا جاتا، پھر راستی اور امانت اور بے مزد تعلیم و تلقین کے لحاظ سے بھی، اور انسانیت کی بھلائی کے لیے قربانیاں دینے کے لحاظ سے بھی جملہ انبیاء کی شخصیتیں ایسی درخشاں ہیں کہ ان کی بات پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا۔ اتنا ہی نہیں، جملہ کائنات کی حسّی آیات و مظاہر اور تاریخ انسانی کے حوادث و واقعات، اُن کی تعلیمات کے فریم میں درست بیٹھتے ہیں۔ نیز کسی بھی دَور میں اُن کو تسلیم کرنے والے افراد کے کرداروں کی بلندی اُن کی صداقت پر ایک عظیم شہادت ہے۔

پس ہم ملتِ اسلامیہ سے وابستہ لوگ کائنات و حیات کا خدا پرستانہ اعتقاد رکھتے ہیں، ہم تمام نظریات و افکار کی آخری کسوٹی علمِ وحی کو مانتے ہیں، ہم خدا کے رسولوں کے اسوہ کو انسانی کرداروں کے لیے معیار سمجھتے ہیں، ہم حق و باطل اور خیر و شر کی ایک خاص تقسیم کے قائل ہیں، ہم پائیدار اخلاقی بنیادوں کے مطابق انسانِ مطلوب کا خاکہ سامنے رکھتے ہیں، ہماری نگاہ میں

انسانی مراتب اور رابطوں اور باہمی حقوق و فرائض کا ایک متعین و مخصوص معاشرتی ڈھانچہ وقعت رکھتا ہے۔ ہم دولت و محنت کا تعاون عدل و احسان کے ذریعے قائم کرتے ہیں، ہم مرد و زن کے دوطرفہ مساویانہ حقوق کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے ادارے کو مستحکم رکھنے کے لیے مرد کو ادارے کی لیڈرشپ پر فائز کرتے ہیں، اسی طرح جنگ و صلح کے حدود، مجلسی آداب و شعائر، روایات و علامات اور ایک مخصوص قسم کا ذوقِ جمال و زیبائی ہمارے تہذیبی سرمایے کے لازمی اجزا ہیں۔ ہمارے اساسی عقائد کے مطابق جو خداپرستانہ تہذیب نمودار ہوتی ہے، اس میں ایک خاص نہج کی ہیئتِ اجتماعیہ جگہ پاسکتی ہے۔

اس تہذیبی نقشے کے مطابق حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معیاری معاشرہ قائم کیا، ایک مکمل ریاست کی تشکیل کی اور اس کی ضروریات کے مطابق موزوں ترین تعلیمی عمل کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں بخوبی چلتا رہا، یہاں تک کہ یہودی مجوسی سازش نے آخری تین خلفاء کو یکے بعد دیگرے شہید کیا اور ابتدائی مسلم معاشرے کو فتنہ و تفرقہ سے بھر دیا۔ رہی سہی کسر حادثۂ کربلا میں پوری کر دی۔ بعد کے ادوار میں جب سلطنت کا نقشہ بدل گیا، ملت کا نظام تعلیم علماء و مفکرین کے قبضے میں رہا۔ اور انھوں نے سلطنت کو اس میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ ملت کے علماء و مفکرین کے ذریعے چلنے والے آزاد نظامِ تعلیم نے بنیادی تہذیبی شعور کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یونانی افکار، عجمی تہذیب، تاتاری بربریت اور ہندی یوگیوں اور تیاگیوں کے تفلسف کے مختلف حملوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ میں ہر مرحلے میں تجدیدی تحریکات اور احیائے اسلام کے جذبات کارفرما رہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سرزمینِ برصغیر پر بھی تحریک مجددیؒ کے زیر اثر دورِ عالمگیری میں اسلامی نظامِ تہذیب بہت بڑی حد تک جلوہ گر ہوا۔

ہم پر مصیبت یہ آئی کہ ایک بیرونی قوم نے ہمیں غلامی میں جکڑ کر نظامِ تعلیم کے ذریعے اپنی مادہ پرستانہ تہذیب کو ہم پر ٹھونسنے کا عمل جاری رکھا۔ اس عرصے میں ہمارے عقیدے،

ہمارے مقصد اور معیارِ انسان مطلوب، یعنی ہمارے اساسی تہذیبی شعور کو بڑی طرح تباہ کیا گیا۔ ہمارا پورا نیشنل ٹائپ غارت ہونے لگا۔ ہمارے امتیازی تہذیبی وجود کے تمام اجزا پراگندہ ہونے لگے۔ ہمارا تصورِ اجتماعیت نگاہوں سے گم ہونے لگا، اور ہماری ملی خودی جو تجدید و احیاء کے لئے قوتِ محرکہ تھی، تعلیم کے تیزاب میں پڑکر راکھ ہونے لگی۔ ہمیں اگر بچایا ہے تو قرآن و حدیث کے اس علم نے جو ایک مشعل کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ رہا اور جس سے بہرہ مند کرنے کے لئے ہمارے اُن علماء، لیڈروں، ادیبوں، مصنفوں اور صحافیوں نے اپنی محنتیں صرف کیں جو مغربی سامراج کی غلامی کے قفس میں بھی اپنی ایمانی روح کو سلامت رکھ سکے۔

غلامی سے نکل کر ہم ایک دوسری آزمائش سے دوچار ہوگئے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم کو اپنے تہذیبی شعور کا ذریعۂ انتقال نہ بنا سکے۔ بلکہ مخالفِ اسلام تہذیبی شعور کے ساتھ ہم نے اسلامیات کے ایک محدود مضمون کا جوڑ لگا دیا۔ اضداد کی اس پیوندکاری سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ایک کے بعد دوسری اور تیسری تعلیمی پالیسیاں بنتی آرہی ہیں۔ مگر تہذیبی نظریۂ تعلیم کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بات بن نہیں رہی۔ تازہ ترین تعلیمی پالیسی پچھلی کوششوں سے بہت بہتر ہے، مگر اس کا بھی مطلوب صرف یہ ہے کہ ہر مضمون میں اسلام کے عناصر کو شامل کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ مغرب سے مستعار علوم اور افکار اور نصابیات میں جو مادہ پرستانہ تصورِ کائنات و حیات، نظریۂ ارتقا کے تحت انسان کا جو حیوانی تصور، نفسیاتی اور تاریخی جبریت کا جو فلسفہ، اخلاق کا جو افادی نظریہ، ادب، سائنس اور ٹیکنولوجی کا جو دیوتائی مرتبہ، اور تحلیل و تحریم اور قانون سازی میں عوامی جذبات و خواہشات کی برتری کی جو فکر شامل ہے، اسے تبدیل کئے بغیر آخر یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس مقصد کی خدمت کے لئے وہ انسان پیدا ہوں جن کا تقاضا اسلام کا تہذیبی نظام کرتا ہے۔

ہمیں تو ایسی یونیورسٹیاں اور کالج درکار ہیں جن سے پڑھ کر نکلنے والے نوجوان اسلامی انقلاب کے سپاہی بن کر نکلیں۔ وہ اپنے دین اور اپنے نظریات و تصورات اور اپنی تہذیب کے اطوار و اقدار کی برتری کا یقین رکھتے ہوئے دنیا بھر کی اقوام کے سامنے ان کے نقیب بنیں۔ یہ اصل مطلوب اگر حاصل ہو تو علمِ ماحول اور علمِ اشیاء کا جو ذخیرہ جہاں سے بھی ملے از خود اپنی جگہ پر نصب ہو جائے گا لیکن اگر تہذیبی شعور اور ملی خودی ہی زندہ و توانا نہ ہو تو آپ اس کی کمر سے اگر سائنس یا ٹیکنولوجی کی تلوار باندھ بھی دیں تو آخر بقاء ارتقا کا جہاد کیسے عمل میں آجائے گا۔

خالی سائنس اور ٹیکنالوجی تو محض بے مقصد خدمت گذار فراہم کرتی ہے جنہیں کسی بھی قوم اور کسی بھی تہذیب کی گاڑی میں قلی بنا کر جوتا جا سکتا ہے۔

آج سے ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہمارا مقصد محض اسلامیات پڑھا دینے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ خواہ اسے ہر مضمون میں شامل کر دیا جائے۔ بلکہ اسلامی نظام تعلیم وہ ہوگا جو غیر اسلامی اور مادہ پرستانہ تہذیبوں کے افکار و نظریات کے خلاف نوجوانوں کو ایمانی جہاد لڑنے کے قابل بنا سکے اور انہیں اسلام کے مکمل تہذیبی شعور سے مسلح کر سکے۔

حضرات! یہ ہے ملخص اس تہذیبی نظریۂ تعلیم کا جس پر میں مسلسل کاوش کرتا رہا ہوں۔ اور حسب عادت حوالوں کا سہارا لئے بغیر میں نے اپنی بات اپنے لفظوں میں بیان کر دی ہے۔

آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے ناچیز خیالات کو آپ نے تحمل سے سنا۔

(یہ مختصر مقالہ انجمن فاضلین (آئی۔ ای۔ آر) کی سالانہ کانفرنس (دسمبر ۱۹۸۸ء) میں پڑھا گیا۔)

سا سائل و مسائل

اسلامی حدود و تعزیرات سے متعلق چند توضیحات

ملک غلام علی صاحب

(۲)

سوال: میں نے جولائی کے شمارے کے ترجمان میں آپ کا جواب "اسلامی حدود و تعزیرات سے متعلق چند توضیحات" پڑھا۔ پھر میں نے مشکوٰۃ، ابوداؤد اور بعض دوسری کتب احادیث میں اس موضوع سے متعلق احادیث کا بھی مطالعہ کیا تو میرے ذہن میں بعض نئے اشکالات پیدا ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عورت کو چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی، اس کے بارے میں بعض حدیثوں میں مذکور ہے کہ اس نے کوئی زیور یا سامان عاریۃً لیا تھا اور پھر مکر گئی تھی جس پر اسے قطع ید کی سزا ملی۔ کیا مانگے کی چیز سے انکار بھی چوری کی تعریف میں آتا ہے یا اس پر چوری کی حد یعنی قطع ید جاری ہو سکتی ہے؟ پھر سنن ابی داؤد میں یہ بھی ہے کہ اس عورت کو سزا دینے سے پہلے آنحضور نے فرمایا کہ جس عورت سے جرم ہوا ہے، کیا وہ توبہ کرے گی؟ مگر جب اس نے توبہ نہ کی تو حد نافذ کر دی گئی، تو کیا توبہ سے حدِ سرقہ یا دوسری کوئی حد شرعی ساقط ہو سکتی ہے؟ اگر ان احادیث پر پیدا ہونے والے ان سوالات کا جواب بھی ترجمان کے ذریعے دے دیا جائے اور ان اشکالات کو رفع کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

جواب: قطعِ ید کی سزا کا زیادہ مشہور واقعہ جو عہدِ نبوی میں پیش آیا ہے وہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت کا ہے۔ اس کے متعلق بلاشبہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ وہ عورت زیور وغیرہ مستعار لے جاتی تھی اور بعد میں مکر جاتی تھی، بعض احادیث میں مانگنے کے بجائے چرانے کا ذکر آیا ہے۔ اس

سے جو اشکال پیدا ہوسکتے ہیں، فقہاء و ائمہ نے مختلف طریق پر ان کا جواب دیا ہے جس کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے۔

اوّلین امر جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ صحیح ترین احادیث میں عاریۃً لینے کے بجائے سرقہ ہی کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر بخاری، کتاب الحدود، کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد...... میں ایک ہی حدیث امام بخاری نے   ہے جس کا ترجمہ یوں ہے۔

"حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ قریش اس مخزومی عورت کے معاملے میں بہت فکرمند اور پریشان تھے جس نے چوری کی تھی (سرقت)۔ کہنے لگے: کون ہوسکتا ہے جو اس معاملے میں سفارش کی جرأت کرے سوائے اسامہؓ بن زید کے جو آنحضورؐ کو نہایت محبوب ہیں؛ چنانچہ حضرت اسامہؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کی تو آپؐ نے فرمایا؛ کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کروگے؟ پھر آپؐ نے قیام فرمایا اور خطبہ ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم میں سے پہلے اسی لیے گمراہ ہوئے کہ ان کے اُونچے خاندان والے نے چوری کی تو اُسے چھوڑ دیا اور جب کمزور نے چوری کی تو اس پر حد جاری کردی۔ اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرتی تو میں اُس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔"

اس حدیث میں نہایت وضاحت و قطعیت کے ساتھ بار بار سرقے کا لفظ آیا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے چوری ہی کی تھی اور چوری ہی پہ اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ چوری کے ساتھ اُسے مانگنے کی چیز سے انکار کرنے کی بھی عادت ہو مگر چوری کی مجرم ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ کیونکہ سرقے کے لفظ کا اطلاق مستعار شے کے انکار پر عربی زبان میں نہیں ہوتا۔ صحیح تر قول کے مطابق اس خاتون کا نام فاطمہ تھا اور اس واقعہ کے   وقت بناتِ طیبات میں سے صرف حضرت فاطمہ بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی حیات تھیں، اس لیے آنحضورؐ نے بطورِ خاص ان کا نام لیا۔ یہ چوری کرنے والی فاطمہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوسلمہؓ کی بھتیجی تھیں جو ام المومنین ام سلمہؓ کے سابق خاوند تھے۔ حضرت عائشہؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ ان خاتون نے صدقِ دل سے توبہ کرکے شادی کرلی تھی اور آنحضورؐ سے مختلف معاملات و مسائل میں رجوع کے لیے یہ میرے پاس آتی تھیں۔ اور میں آپ سے پوچھ کر انہیں جواب دیتی تھی۔ اکثر محدثین نے سرقے کی بجائے عاریت کی روایات کو شاذ ہونے کی

بنا پر ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام قرطبیؒ کے حوالے سے لکھا ہے:

روایۃ انہا سرقت اکثر واشہر من روایۃ الجحد۔

وہ روایت جس میں چوری کا ذکر ہے، اس روایت سے زیادہ مشہور اور کثیر الاسناد ہے جس میں مانگ کر مکر جانے کا ذکر ہے۔

صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں بھی دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ امام نووی ان کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علماء کے نزدیک ان روایات سے مراد یہ ہے کہ اس عورت کو قطع ید کی سزا چوری پر ملی تھی۔ اشیاء عاریت لینے کا ذکر اس عورت کی ایک مزید صفت اور پہچان کے طور پر کیا گیا ہے اس لیے نہیں کیا گیا کہ مستعار چیزوں کے انکار پر اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ امام مسلم نے ساری روایات کو جمع کر دیا ہے۔ لیکن قطعِ ید والی روایات میں تصریح ہے کہ یہ حد چوری کے سبب جاری ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطعِ ید کی سزا کا واقعہ ایک ہی ہے جو اس خاتون سے متعلق ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے یوں بھی کہا ہے کہ دونوں واقعے مختلف ہیں مگر عاریت لینے پر قطعِ ید والی روایت شاذ اور اکثر راویوں کی روایت کے مخالف ہے، اس لیے ناقابلِ عمل ہے۔ جمہور علماء کا مسلک یہی ہے کہ مستعار شے سے انکار قطعِ ید کا موجب نہیں ہے۔"

امام ابوداؤد نے جہاں عاریت سے منکر ہونے والی روایت درج کی ہے، اس کی شرح میں مولانا شمس الحق نے عون المعبود میں امام زیلعی کے حوالے سے لکھا ہے:

و ظہر ان ذکر العاریۃ انما کان تعریفًا لہا بخاص صفتہا اذ کانت کثیرۃ الاستعار حتی عرفت بذلک کما عرفت بانہا مخزومیۃ واستمر بہا ھذا الصنیع حتی سرقت فامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بقطعہا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس عورت کے عاریۃً سامان لینے کا ذکر اس لیے ہے کہ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اکثر چیزیں مستعار لے جاتی تھی۔ گویا کہ جس طرح مخزومی قبیلے سے ہونا اس کی ایک صفت تھی اسی طرح مانگے تانگے کی چیزیں حاصل کرنے کی عادت تھی، حتیٰ کہ آخر کار اس نے چوری بھی کی

جس پر آنحضورؐ نے قطع ید کا حکم دیا۔"
تقریباً یہی بات امام خطابی نے اپنی شرح سنن ابی داؤد، معالم السنن میں فرمائی ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:-

انما ذکرت العاریة والجحد فی هذه القصة تعریفاً لها بخاص صفتها اذ کانت تکثر ذلك کما عرفت بانها مخزومیه وکانها کما اکثر منها ذلك ترقت الی السرقة وتجرأت علیها۔

(اس روایت میں مستعار لینے اور انکار کرنے کا ذکر اس لیے ہے کہ وہ اس خصلت کے ذریعے پہچانی جا سکے۔ کیونکہ جس طرح اس کا مخزومی ہونا معلوم و مشہور تھا۔ اسی طرح اس کی یہ عادت بھی معروف تھی، پھر اسی نے ترقی کرتے کرتے چوری کی شکل اختیار کی اور اس نے چوری کرنے کی جرأت کی۔"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان روایات پر مفصل بحث کی ہے۔ امام قرطبی کا ایک قول انہوں نے شروع میں دیا ہے جو اوپر نقل ہو چکا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے قرطبی ہی کے حوالے سے چند وہ وجوہ نقل کیے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قطعِ ید کی سزا چوری ہی پر دی گئی تھی۔ وہ وجوہ یہ ہیں:-

اوّلاً حدیث کے آخر میں لوان فاطمة سرقت۔۔۔ کے الفاظ ہیں جو قطعی طور پر دلالت کرتے ہیں کہ ہاتھ چوری کی بنا پر کاٹا گیا تھا۔ اگر قطع ید مانگے ہوئے مال سے انکار پر مبنی ہوتا تو پھر چوری کا ذکر غیر ضروری تھا اور آنحضورؐ فرماتے لوان فاطمة جحدت العاریة .... (اگر فاطمہؓ بھی مستعار مال سے انکار کرتی .....)

ثانیاً اگر یہ قطع ید کی سزا انکار عاریہ پر ہوتی تو جو مال بھی کسی کے ذمے واجب الاداء ثابت ہو جاتا اور وہ اس کی ادائیگی یا واپسی سے انکاری ہوتا، اس پر قطع ید کی حد لازم آتی خواہ یہ مال مانگ کر لیا جاتا یا کسی دوسرے طریق پر انکار کرنے والے کے ذمے نکلتا۔

ثالثاً اگر عاریت والی روایت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ اس کی رو سے مانگ کر لے جانے اور اس کی واپسی سے انکار کرنے پر بھی ہاتھ کاٹنا ضروری ہے تو یہ اس قوی حدیث کے خلاف

پڑتا ہے جس میں آنحضور نے فرمایا ہے:

لیس علی خائن ولا مختلس ولا منتھب قطع۔

(خائن اور چھین جھپٹ کر لینے والے پر قطعِ ید کی سزا نہیں)

حافظ ابن حجرؒ قرطبیؒ کے ان دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

"خائن وغیرہ اور چھین کر لے جانے والے کے بارے میں اجماع ہے کہ اس پر قطعِ ید کی حد جاری نہیں ہوگی۔ جب تک کہ اس کا فعل رہزنی (قطع الطریق) کی تعریف میں نہ آئے۔ (البتہ خیانت وغیرہ پر کوئی تعزیری و تادیبی سزا یا تاوان عائد ہو سکتا ہے)۔

اب تک کی بحث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث یا سنت میں جہاں ہاتھ کاٹنے کی حد کا ذکر ہے اس کا تعلق سرقے سے ہے، کسی دوسری طرح کی خیانت یا غصب سے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بھی والسارق والسارقۃ...... کے الفاظ ہیں، جن کا اطلاق بالاتفاق چوری کرنے والے مرد اور عورت پر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ قطعِ ید کے لیے حدیث میں کچھ دیگر لوازم و شرائط بھی مذکور ہیں جن کی روشنی میں فقہاء و محدثین نے جامع قواعد و ضوابط بیان فرما دیے ہیں، مثلاً یہ کہ مال مسروق محفوظ جگہ سے چرایا گیا ہو، وہ جلد خراب ہو جانے والا نہ ہو، اس کی قیمت ایک خاص نصاب تک پہنچتی ہو، اس کی ملکیت میں چور حصہ دار نہ ہو، وغیر ذالک جس کی تفصیل کا یہ موقع و محل نہیں۔

اس کے بعد اب حدیث کے اس ٹکڑے کے متعلق توضیح باقی رہ جاتی ہے جس میں آنحضورؐ کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ کیا وہ عورت اللہ اور اس کے رسول کی طرف تائب و راجع ہوتی ہے؟ مگر وہ نہ اٹھی، نہ اس نے کوئی بات کی۔ روایت کے اس حصے کے بارے میں امرِ اول جو قابل وضاحت ہے، وہ یہ ہے کہ یہ آخری الفاظ ایک راویہ صفیہ بنت ابی عبید نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیے ہیں۔ مگر ان دونوں کا ہم عصر ہونا اور صفیہ کا ابن عمرؓ سے سماعتِ حدیث کرنا ثابت نہیں، اس طرح سند میں انقطاع کی وجہ سے ضعف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حد جاری کرنے سے پہلے اگر آنحضورؐ نے اُسے توبہ کی تلقین کی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توبہ کرنے پر حد ساقط ہو جاتی۔ بعض شارحین نے یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ آنحضورؐ چونکہ شارع تھے تو ممکن ہے کہ آپ توبہ کے بعد سزا نافذ نہ فرماتے، ساتھ ہی ان حضرات نے فرمایا کہ یہ اختیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ماسوا کسی دوسرے کو حاصل

نہیں ہے۔ بہرکیف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنحضورؐ نے حدود کے معاملے میں اس طرح کے اختیار کو کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ دیگر نصوص کتاب و سنت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ مجرد توبہ کے بل پہ حدود شرعیہ میں سے صرف محاربہ اور فساد فی الارض کی وہ دنیوی حد ہی معاف ہوسکتی ہے جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے جس کے مجرم کو فقہی اصطلاح میں راہزن یا قاطع الطریق کہا جاتا ہے اور یہ معافی بھی قرآنی تصریح کے مطابق اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مجرم قابو پائے جانے اور گرفتار ہونے سے پہلے تائب ہوکر از خود اپنے آپ کو پیش کر دے۔ آنحضورؐ نے جن حدود کا اجراء اپنے سامنے فرمایا ہے ان میں بالعموم آپ مجرم کو توبہ کی تلقین فرماتے تھے۔ یہ تلقین و ترغیب اجرائے حد سے پہلے بھی ہوسکتی تھی اور قصاص و حدود کی جن صورتوں میں سزائے موت نہیں، ان میں نفاذِ حد و قصاص کے بعد بھی ہوسکتی تھی۔ بعض مرتبہ آنحضورؐ نے حد جاری ہونے کے بعد توبہ کرائی لیکن یہ خاص واقعہ جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں آپؐ نے حد سے پہلے توبہ کی دعوت دی ہو اور آپ کا ارادہ توبہ کے بعد حد نافذ کرنے کا ہو۔ حدیث کے اس حصہ میں یہ بات نہیں فرمائی گئی کہ اگر تم توبہ کر لوگی تو دنیوی سزا سے بچ جاؤگی۔ اس روایت میں صرف یہ الفاظ زیادہ ہیں:

هل من امرأة تائبة الى الله عز وجل و رسوله

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اخروی عقوبت کا تعلق ہے اس سے مجرم کو نجات دلانے والی چیز سچی توبہ ہی ہے۔ جرم کا مرتکب اگر سچے دل سے تائب نہ ہوا اور دنیا میں سزا پانے پر وہ اللہ سے اور زیادہ دور ہوا اور دل میں کڑھتا اور پیچ و تاب کھاتا رہے تو اس کے لیے دنیا کی سزا آخرت کا کفارہ مشکل ہی سے بن سکتی ہے۔ لیکن یہ امر حکمت شریعت کے منافی ہے کہ کسی مجرم سے یہ کہا جائے کہ اگر تو توبہ کرلے تو تیرے لیے حد ساقط کر دی جائے گی، بالخصوص وہ مجرم جو جرم کا عادی ہو، یا ارتکاب کے بعد اس سے انکاری ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر توبہ و رجوع کے بعد کسی گنہ گار کو حد معاف فرماتے تو اس درگذر کے سب سے زیادہ مستحق وہ حضرات تھے جنہوں نے خود حضور نبوی میں پیش ہوکر بتکرار و اصرار اپنی خطاء کا اقرار کیا۔ مثلاً حضرت ماعزؓ بن مالک یا قبیلۂ غامدیہ کی وہ اللہ کی بندی جس نے وضع حمل اور بچے کو دودھ چھڑانے کے بعد بھی اپنے آپ کو حدِ رجم کے لیے پیش کیا۔ اگر ان سے توبہ نہیں کرائی گئی یا ان سے توبہ کرانا مذکور نہیں ہے۔ تو

(باقی بر صفحہ ۴۸)

مطبوعات

کتاب : تجلیات ربانی حصہ اوّل
(ترجمہ و تخلیص مکتوبات مجدد الف ثانی)
مرتبہ : نسیم احمد فریدی ۔ امروہوی
ناشر : مکتبہ سراجیہ ۔ خانقاہ احمدیہ سعیدیہ
موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان
ضخامت : ۲۶۴ صفحات ۔ دبیز سرورق
قیمت : ۱۸/ روپے

اس مفید کتاب میں حضرت شیخ احمد (سرہندی) مجدد الف ثانی رحؒ کے مکاتیب کا ایک حصہ بصورت ترجمہ و تلخیص پیش کیا گیا ہے ۔ شروع میں شیخ کے حالات زندگی دیے گئے ہیں جو باوجود اجمال کے بہت بصیرت افروز ہیں ۔

ابتدائی اوراق میں اس فتنہ کا ذکر کیا گیا ہے جو فتنۂ برزنجی کہلاتا ہے ۔ محمد صالح اورنگ آبادی (یا گجراتی) اور محمد عارف اور عبداللہ سورتی نے حضرت مجدد کے بعض مکاتیب کا ترجمہ فارسی سے عربی میں تحریف کے ساتھ کر دیا اور سید محمد برزنجی ساکن مدینہ منورہ کو بھیجا کہ وہ ان فاسد خیالات کا تنقیدی و تردیدی جواب لکھ دیں ۔ چنانچہ سید برزنجی نے حضرت مجدد کے خیالات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر کیا اور مدینہ اور مکہ کے علما سے اس کی تصدیق و تائید چاہی ۔ بیشتر علماء نے انکار کیا ۔ دو ایک غیر معتبر علماء نے دستخط کر دیے ۔ مگر معاملہ جب شیخ نور الدین محمد بیگ کے پاس پہنچا تو وہ چونکہ فارسی و عربی دونوں زبانیں جانتے تھے ، اس لیے انہوں نے حضرت مجدد کے جملہ اصل مکاتیب کو منگوا کر پڑھا ۔ تب ان پہ اس حذف و زیادتی کا حال کھلا جو عربی ترجمہ میں تھی ۔ پھر شیخ نور الدین محمد بیگ نے ایک جوابی رسالہ لکھا ۔ نیز حضرت کے بعض مکاتیب کی عبارتوں کا عربی میں صحیح ترجمہ کیا ۔ اس طرح برزنجی فتنہ ختم ہوا ۔

لیکن علمائے حق اور داعیانِ اقامتِ دین کی شان ہی یہ ہے کہ ان کی مخالفت میں فتنے اٹھتے ہی رہتے ہیں، اور ایک ختم ہوتا ہے تو دوسرا سامنے آجاتا ہے۔

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ آگرہ یونیورسٹی کے شیعہ نوجوان اطہر عباس رضوی ایم اے پی ایچ ڈی۔ (ریڈر و صدر شعبۂ تاریخ جموں و کشمیر یونیورسٹی) نے انگریزی میں ایک کتاب (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) بہ عنوان "سولہویں اور سترھویں صدیوں میں شمالی ہند کی مسلم احیائی تحریکیں" (اصل انگریزی نام) (MUSLIM REVIVALIST MOVEMENTS IN NORTHERN INDIA IN THE 16 TH & 17 TH: CENTURIES) لکھی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مجدد کے افکار اور اُن کے نام کی مخالفت میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کتاب بظاہر بڑی تحقیقی ہے، مگر رسالہ معارف اعظم گڑھ کے جو تنقیدی پیراگراف درج ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ماخذ طرح کمزور ہیں۔ نیز زبان بڑی گھٹیا استعمال کی گئی ہے اور جملے گستاخانہ ہیں۔ جبکہ ایک یہودی مصنف وائی فریڈ مان نے حضرت مجدد کے متعلق جو مقالہ (شیخ احمد سرہندی اور آئندہ نسلوں کے بارے میں ان کا نظریہ) کتابی شکل میں میکگل یونیورسٹی پریس مانٹریال سے ۱۹۷۱ء میں شائع کرایا ہے، اس کی زبان زیادہ شائستہ ہے مستزاد یہ کہ یہودی مصنف نے اطہر عباس کے خیالات پر اعتراضات کئے ہیں۔ معارف کا تبصرہ بڑی علمی سطح کا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔

حضرت مجدد کے مکاتیب کے بارے میں میں مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جہاں ایمانیات و عرفانیات کا مجموعہ ہیں، وہاں ان کا ادبی معیار بھی خاصا دلکش ہے۔ صاحبِ مکاتیب آیات و احادیث کے ساتھ ساتھ نہایت مؤثر اشعار بھی شاملِ تحریر کرتے ہیں اور خاص اصطلاحات اور تشبیہیں وضع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو اپنے دور کی ذہانت کے قریب لانے میں کامیاب رہے۔

اسی کتاب میں ناشر کی یہ فریاد پڑھ کر افسوس ہوا کہ مکتبہ سراجیہ نے مولینا محمد منظور نعمانی سے جن تین کتابوں کے حقوقِ اشاعت حاصل کیے تھے، اُن کا لحاظ کیے بغیر لاہور کے کسی ناشر نے ان میں سے ایک کتاب شائع کر دی ہے۔ ناشرین کا بھی ایک ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور بڑی بڑی قوموں کے غیر مسلم ناشرین تک خلاف ورزی نہیں کرتے، خصوصاً وہ مسلم ناشرین جو دینی کتب شائع کرتے ہوں، اُن کی ذمہ داری تو اور بھی نازک ہوتی ہے۔ جن ناشر صاحب نے ایسی حرکت چند روپوں

کی خاطر کی ہے ۔ وہ خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے ایمان سے کام لے کر محمد سعد سراجی مرشد بابا سے نہ صرف معافی مانگیں بلکہ ناجائز طور پر حاصل کردہ مالی مفاد بھی اُن کے حوالے کر دیں ۔

تذکرۂ امام ربّانی، مجدّدِ الفِ ثانی

مرتبہ: مولینا محمد منظور نعمانی ۔ مدیر الفرقان لکھنؤ

ناشر: مکتبہ سراجیہ، خانقاہ احمدیہ سعیدیہ موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں

ضخامت: ساڑھے تین سو صفحات ۔ دبیز سرورق

قیمت: -/۲۲ روپے

حضرت شیخ احمد مجدد الفِ ثانی، برصغیر میں تحریک نظامِ اسلامی کے بانی ہیں ۔ یہ سچا مسلمان اور یہ سچا صوفی اُس ذمہ داری کو خوب سمجھا جو رسولِ آخر الزمان کے ہر اُمّتی پر عائد ہوتی ہے ۔ رہبت سے خلوتیانِ تصوف کی نگاہوں سے یہ ذمہ داری اوجھل رہی ۔ انہوں نے ساری توجہ انفرادی روحانی اصلاح اور آخروی کامیابی پر صرف کر دی ، مگر اس دنیا کی اجتماعی زندگی سنوارنے کا جو بھاری فریضہ ہر صاحبِ ایمان کو پکارتا رہتا ہے ، وہ درکنار رہ گیا ۔ حضرت شیخ احمدؒ نے تصوف کے ساتھ سیاسی تصرف کا حق بھی ادا کیا ۔ اور آپ کے کارنامے نے مغلیہ سلطنت کے آخری دور کی تاریخ کو منور کر دیا ۔ دعوتِ مجدّدی کی شعاعیں آج تک برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کی ذہنی دنیا کو روشنی و حرارت دے رہی ہے ۔

حضرت مجدد کے کارنامے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے ۔ میرے نزدیک جہاں حضرت کی مساعی الحاد اور رفض اور بدعت کے خلاف ایک جہاد کی نوعیت رکھتی ہیں ، وہاں بڑی عظیم خدمت یہ انجام پائی کہ ہندو تہذیب کے آخری زوردار ترین حملے کا آپ نے ایسا کامیاب مقابلہ کیا کہ شاہی محل اور دربار کو جس سیلاب کی موجوں نے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کا منہ پھیر دیا ۔ مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ بڑا اسنگین تھا جب کہ اُن کے علماء کو قتل یا جلا وطن کیا گیا ۔ ان کے اعتقاد مسخ کئے جانے لگے ، اُن کے نظامِ عبادات کو خراب کیا گیا ، ان کے شعائر کو اضحوکہ بنا دیا گیا ۔ شراب اور قمار کو فروغ ملا ۔ کتوں اور سوروں کو معزز جانور قرار دیا گیا ۔ ڈاڑھیاں منڈوانے کی رسم نے پہلی بار محبوبیت اختیار کی ، جبینوں پر قشقے لگائے جانے لگے ۔ دینِ الٰہی کے نام سے ایک گلدستہ نما پچ رنگا مذہب اس لیے ایجاد کیا گیا کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ وطنی قومیت مسلط کی جا سکے ۔

تاریخِ اسلام میں اس قسم کے حملے جب بھی ہوئے ہیں، ہمیشہ کسی نہ کسی قوت نے اُٹھ کر اعلائے اسلام کے لیے ملّت کے احساسات کو بیدار کیا ہے۔ بیشتر تحریکیں اس قسم کے حالات سے نمودار ہوئیں۔ دَورِ اکبری میں جب ہندو تہذیب کا کھُلا کھُلا سنگین حملہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شروع ہوا تو حق تعالیٰ نے حضرت شیخ احمدؒ کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا کیا۔ شیخ نے ٹھنڈے طریقے سے اتنا مؤثر اور تیز رفتار کام کیا کہ اس کی لہریں مسندِ شاہی تک پہنچنے لگیں۔ عتاب ہوا، جنونِ عشق کی توامنع زنجیرِ زنداں سے کی گئی۔ مگر ذوقِ یقین کے اثر سے زنجیریں کٹ گئیں، اور شاہی طمطراق ایک درویش کے ایمان سے شکست کھا گیا۔ پہلے حکومت کی مخالفت ختم ہوئی۔ پھر ملائمت کا آغاز ہوا، بعد میں ملاطفت کا مرحلہ آیا، اور عاقبت متابعت پر ہوئی۔ آخری نتیجہ اورنگ زیب عالمگیر کی شکل میں سامنے آیا جس کے ہاتھوں برصغیر میں اسلامی نظام بڑی حد تک جلوہ گر ہوا۔

حضرت مجددؒ کے متعلق سیاسی لیڈروں، ادیبوں، صحافیوں، استادوں اور نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے اور تحریکِ مجددی اور اس کے اثراتِ ما بعد کا عمیق نظری سے جائزہ لینا چاہیے۔ کیونکہ برصغیر کی مختلف اسلامی تحریکات (لٹریری اور سیاسی) میں یہ اثرات کارفرما رہے ہیں، بلکہ اگر تحریکِ مجددی کا ایمان افروز اور تحریک آموز پس منظر موجود نہ ہوتا تو شاید تحریکِ پاکستان اُبھر نہ سکتی اور آج ہم ایک آزاد اسلامی جمہوریہ کے شہری ہوتے۔

یہ کتاب دراصل رسالہ الفرقان کے ایک خاص نمبر (۱۳۵۷ھ) میں شائع شدہ چند گراں قدر مقالات کا مجموعہ ہے جسے مولینا منظور نعمانی صاحب جیسی معروف دینی شخصیت نے مرتب کیا تھا پہلا کتابی ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور یہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء کا ہے۔

(۲)

(ملفیہ اشارات)

اب ذرا ایک ناخوشگوار قصّہ بھی!

اسلام آباد میں ایک ادارہ "مجلس ادبیات پاکستان" (PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS) کے نام سے قائم ہوا۔ پہلے جب اس کے سربراہ احمد سرفراز تھے تو یہ زیادہ قابل توجہ نہیں تھا۔ کیونکہ اکثر ادبی ولسانی ادارات پہ اشتراکی ذہن کے اصحاب کا قبضہ ہے اور وہ ان اداروں میں بیٹھ کر اپنے جیسے کے لوگوں کی پرورش کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں احمد فراز ایک اور ادارے میں منتقل ہو گئے اور ان کی جگہ مسیح الدین صدیقی آ گئے جو تعلیم کے وفاقی سیکرٹری ایٹ کے آدمی ہیں۔ وزیر تعلیم محمد علی آف ہوتی مردان بھی اسلام سے محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ قدرتی طور پہ اس ادل بدل سے اچھی امیدیں وابستہ تھیں۔

لیکن چند ہی روز پہلے اکیڈمی آف لیٹرز کے لیے تاسیسی ممبران یا سرپرستوں کے جو نام سامنے ہیں، اُن کو دیکھ کر سر چکرا گیا۔ ان میں جوش ملیح آبادی (شاعر شاہد و شراب) جیسی بدنام اور متروکِ زمانہ شخصیت بھی شامل ہے۔ اور پھر کمیونسٹ دانشوروں کا ایک گروپ مع اپنے ایک امام کے اسی صف میں ہے۔ کچھ اچھے لوگ (مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ) بھی ہیں، مگر فی الحقیقت وہ اقلیت میں ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اسلامی ادب کے دائرے سے تعلق رکھتا ہو۔ اور وہ ادب کے دھارے کا رُخ فلاح و تعمیر کی طرف موڑ سکے۔

مجھے حیرت ہے کہ کس شخص یا کس گروہ نے ناموں کی فہرست بنا کر محترم جنرل محمد ضیاء الحق کے سامنے منظوری کے لیے رکھی ہے، کیونکہ یہ فہرست تو خاص بدنام کن ہے[1]

---

[1] قضیہ صرف فہرست ہی کا نہیں، اکادمی کے جو مقاصد اخبارات میں شائع ہوئے اُن کا مزاج بالکل سیکولر ہے اور اس وجہ سے مقاصد خود بے مقصد ہیں۔ صرف ایک جگہ نظریہ پاکستان (باقی بر صفحہ آئندہ)

سوال یہ ہے کہ ایک حکومت جو اسلام کا راستہ بنا رہی ہے، کیا اس کی نگاہ میں یہی لوگ اس منصب کے اہل قرار پاتے ہیں کہ وہ علم و ادب کے راستے سے اسلام کے حق میں ماحول تیار کرانے کے لیے مختلف لوگوں اور اداروں سے کام لیں گے؟ کیا آج بھی صدر ایوب کے دور کی رائٹرز گلڈ بنانے والوں کا طرزِ فکر کام کر رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا رائٹرز گلڈ کا وجود ہی کافی نہ تھا؟ ایک نئے ادارے پر کیوں اسلامی نظام کی طلب گار قوم کا روپیہ صرف کیا جائے، اور کیوں اس روپیے سے بادہ خواروں، فحش نگاروں اور سوشلسٹ دانشوروں کی پرورش کی جائے؟

با ادب محترم جنرل محمد ضیاء الحق اور وزیرِ تعلیم اور دیگر وزراء کے علاوہ اسلامی کونسل کے ڈائرکٹر اور قومی اتحاد کے صدر سے گذارش ہے کہ وہ اس ناقابلِ فہم فہرست کو ختم کریں، اور نئی فہرست تیار کریں۔ جو فہرست سامنے آئی ہے وہ کوئی نوشتہ وحی نہیں کہ اسے بدلا گناہ ہو، چاہے اس میں مندرج شخصیتوں کے ہاتھوں اسلامی مقاصد کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔

واضح رہے کہ اکاڈیمی آف لیٹرز معمولی ادارہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ تمام شہروں میں کام کرنے والے متعدد علمی، ادبی، اور لسانی ادارات وابستہ کیے جا رہے ہیں۔ یہ اکادمی تو پورے پاکستان کے نظامِ افکار کی کارپرداز ہوگی۔ ایسے معاملے میں کوئی دیانت دار آدمی چشم پوشی سے کام نہیں لے سکتا۔

مقصود یہ نہیں کہ آپ اس کام پر ائمۂ مساجد یا مفتیانِ شرع اور فقہا کو مقرر کریں۔ ہم سے اگر پوچھا جائے تو ہم ایسے دانشوروں کے نام دے سکتے ہیں جو ڈاکٹر، پروفیسر، ایڈیٹر اور معروف قسم کے شاعر و ادیب ہوں۔ آپ ایک کو ناپسند کریں، ہم اور نام دے سکیں گے۔

ساتھ ہی میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اسی طرز کے جو مختلف ادارات ملک میں

(بقیہ حاشیہ) کی ترکیب آگئی ہے۔ ...... باقی رہا اسلامی فکر یا اسلامی ادب کے دائروں میں کام کرنے کا مسئلہ تو اس کا نام و نشان نہیں۔

کیا بیوروکریسی کا ذہن اسلامی سوچ بچار کے لحاظ سے اتنا بنجر ہے؟

صرف کثیر سے چل رہے ہیں ان کا احتساب کر کے از سرِ نو ان کی تشکیل اسلامی مقاصد کے تحت کی جائے۔ مثلاً مرکزی اُردو بورڈ نہ، مجلس ترقی ادب، اقبال اکیڈمی، آرٹ کونسل، نیشنل سنٹر نہ، بک فاؤنڈیشن، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن، ساؤتھ ایسٹ ایشیا، یورپ اور مشرق وسطیٰ وغیرہ کے متعلق مختلف یونیورسٹیوں کے تحت تحقیق کا کام کرنے والے ادارات، ان میں سے بیشتر یا تو کمیونسٹوں کی پرورش گاہیں ہیں، یا کچھ مفاد پرستوں کے اڈے ہیں۔ بعض کا انتظام اسلامی ذہن رکھنے والے شرفاء کے ہاتھ میں بھی ہے۔ بہر حال ان کی اکثریت تجدید کی محتاج ہے، ورنہ اوپر جو کام ہو رہا ہے اسے ان اداروں کی سرپرستی میں زیرِ زمین مخالفانہ قسم کا فکری کام کرنے والے حضرات تباہ کرنے کا سامان کرتے رہیں گے۔ وہ بھی سرکاری اور قومی خرچ پر!

براہ کرم! اس بارے میں فوری نوٹس لیجیے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

فقط اس وجہ سے کہ ان کا رجم کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا اور بار بار پیش کرنا ہی ایک مجسم اور زبانِ حال سے ایک ایسی سچی توبہ ہے جس کے بعد زبانِ قال سے توبہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے تو ان کے حق میں آنحضورؐ نے بصراحت فرمایا کہ انہوں نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ وہ ان کے پورے قبیلے یا پورے شہر پر تقسیم ہو تو ہر شخص بخشا جائے، خواہ وہ کتنے ہی بڑے گناہ کا مرتکب ہو۔ اور خاتون کے بارے میں فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور توبہ کیا ہو گی کہ اس نے اپنی پیاری جان قربان کر دی۔

تفہیم القرآن

پارۂ اوّل - سورۃ الفاتحہ والبقرہ - سورۃ التوبہ ـــــ سورۃ الفرقان
سورۃ العنکبوت - سورۃ لقمان - سورۃ الاحزاب ـــــ سورۃ یٰس
سورۃ الفتح - سورۃ الحجرات - اور - سورۃ الرحمٰن - کے بعد

تفسیر تیسواں پارہ

اِدارۂ ترجمان القرآن کے روایتی معیار کے
مطابق شائع کیا گیا ہے۔ آج ہی آرڈر بک کرائیں

○

ولایتی کاغذ ـــــ آفسٹ طباعت ـــــ خوب صورت کور

سائز: ۲۲ × ۱۸/۸

○

ہدیہ: بیس روپے

○

اِدارۂ ترجمان القرآن ○ اچھرہ، لاہور